Regd. L. No.7243

Phone 880800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مئی 1983

اس پرچہ میں

حقیقت خرافات میں کھو گئی

(بتقریب یوم اقبال رح)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلی فون	بدل اشتراک
۳	۸۸۰۸۰۰	سالانہ
تین روپے	خط و کتابت	پاکستان - ۳۶/ روپے
	ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ - بی گلبرگ ۲ لاہور	غیر ممالک - ۸۶/ "
شمارہ ۵	مئی ۱۹۸۳ء	جلد ۳۶

فہرست

۱- لمعات ... (۱) داڑھی کا مسئلہ - (۲) عورت کا مقام .. ۲
(۳) غلام اور لونڈیاں .. - (۴) مساجد کی حیثیت ..
۲- ۲۱ اپریل کی یاد میں تقریبات ... ۸
۳- حقیقت خرافات میں کھو گئی - (محترم پرویز صاحب کا خصوصی درس) ۹

بتقریب یومِ اقبالؒ

۴- سرسیدؒ۔ اقبالؒ اور قائداعظمؒ ... ۴۲
(مملکتِ پاکستان کے اقنومِ ثلاثہ)

۵- باب المراسلات - تقیہ اور مودودی مرحوم ... ۵۱
۶- توہم پرستانہ اسلام - (محترم پرویز صاحب) ... ۵۷

باسمہ تعالیٰ

لمعات

اس ماہ کے لمعات چند خبروں پر مشتمل ہیں:-

(۱) داڑھی کا مسئلہ

۱۳ اپریل ۱۹۸۳ء کے روزنامہ جنگ (لاہور) میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے:-

وفاقی شرعی عدالت میں ایک شخص انصار برنی کی جانب سے ایک درخواست دائر کی گئی ہے جس میں داڑھی نہ رکھنے والے سرکاری ملازمین کی حیثیت کو چیلنج کیا گیا ہے۔ شرعی عدالت میں صدر جنرل محمد ضیاء الحق، اٹارنی جنرل شریف الدین پیرزادہ، چیف جسٹس وفاقی شرعی عدالت جسٹس آفتاب حسین، چیف جسٹس سندھ ہائی کورٹ جسٹس عبدالحئی قریشی، وفاقی شرعی عدالت کے جسٹس جناب علی حسین قزلباش اور پاکستان میں آباد داڑھی نہ رکھنے والے مسلمانوں کو فریق بنایا گیا ہے۔ شرعی درخواست میں انصار برنی نے قرآن و سنت کے حوالے سے داڑھی کی شرعی حیثیت کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ داڑھی کی اسلام میں مسلمہ حیثیت ہے لہٰذا تمام اہم سرکاری ملازمین کو جو داڑھی کے بغیر ہیں فوری طور پر سبکدوش کر دیا جانا چاہئے، انہیں نااہل قرار دیا جائے اور تمام عہدوں پر باریش افراد کی تقرری لازمی قرار دی جائے۔ قرآن و سنت کے حوالے سے مسٹر انصار برنی نے یہ موقف اختیار کیا کہ داڑھی منڈوانا حرام ہے اور مردوں کے علاوہ ہیجڑے ہی داڑھی صاف کرا سکتے ہیں۔ حضرت عمرؓ اور ابن ابی لیلیٰ قاضی مدینہ نے بغیر داڑھی والے شخص کی شہادت رد فرمائی۔ حضورؐ نے داڑھی کو انبیاء کرام کی متفقہ سنت فرمایا ہے امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک داڑھی کا منڈوانا حرام ہے۔ درخواست گزار نے فاضل عدالت سے استدعا کی ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا مفتی ولی الرحمٰن، حاجی فاروق ناشکند ایڈووکیٹ جنرل سیکرٹری کراچی بار کو بطور گواہ طلب کیا جائے۔

اس کے بعد، اسی اخبار کی اشاعت بابت ۱۹ اپریل میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے:-

سابق طالب علم راہنما انصار برنی، ایڈووکیٹ نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کو ایک درخواست بھیجی ہے جس میں ان کی توجہ وفاقی شریعت عدالت کے رجسٹرار کے ایک خط کی جانب مبذول کرائی گئی ہے۔ جس کے ہمراہ رجسٹرار نے انصار برنی کی درخواست انہیں واپس بھیج دی ہے۔ انہوں نے ۹ اپریل ۱۹۸۳ء

کو وفاقی شرعی عدالت میں استغاثہ دائر کیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ملکی حکام کو داڑھی رکھنے کا حکم دیا جائے۔ انصار برنی کی یہ درخواست رجسٹر ہو گئی تھی لیکن گزشتہ روز اچانک رجسٹرار فیڈرل شریعت کورٹ نے اپنے ایک خط کے ہمراہ ان کی وہ اصل درخواست ان کو واپس بھیج دی جس کے خلاف انصار برنی ایڈووکیٹ نے آج سپریم کورٹ کے فاضل چیف جسٹس کو ایک درخواست ارسال کی جس میں کہا گیا ہے کہ انہوں نے ایک درخواست کے ذریعے ۹ اپریل کو وفاقی شریعت عدالت میں مقدمہ دائر کیا تھا اور اس درخواست کا اندراج نمبر کے ۔ ۵ کے تحت ہوا تھا۔ جب کہ ۱۷ اپریل کو فاضل رجسٹرار نے انہیں ایک خط کے ہمراہ وہ درخواست واپس کر دی۔ جب کہ اس سماعت کا اختیار فاضل ججوں کو تھا اور وہی اس پر فیصلہ کر سکتے تھے۔ اس طرح بغیر سماعت درخواست واپس کر کے شریعت کورٹ قوانین کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ انہوں نے چیف جسٹس سپریم کورٹ سے استدعا کی ہے کہ انصاف، شریعت اور قانون کے اعتبار سے کوئی مناسب فیصلہ صادر فرمائیں۔

---

(۲) عورت کا مقام

روزنامہ جنگ کی ۱۵ اپریل ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے:۔

سپریم کورٹ کی اپیلیٹ شریعت بنچ میں وفاقی شرعی عدالت کے اس فیصلے کو چیلنج کر دیا گیا ہے جس میں عورت کے قاضی مجسٹریٹ یا جج ہونے اور عورت کی شہادت کو حدود و قصاص حیثیت پر ساملے میں تسلیم کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ وفاقی شرعی عدالت میں اس سلسلے میں درخواست جناب انصار برنی ایڈووکیٹ نے پیش کی تھی اور اب اپنی درخواست کے اخراج کے بعد انہوں نے ہی اس فیصلے کو چیلنج کیا ہے۔ سپریم کورٹ میں اپنی اپیل میں انصار برنی نے وفاقی شرعی عدالت کے اس فیصلے کو شرعی قانون اور قرآن و سنت کے خلاف قرار دینے کی درخواست کرتے ہوئے کہا ہے کہ عدالت کا وہ فیصلہ قرآنی احکامات اور آنحضرتؐ کی احادیث کے منافی اور اجماع کے فیصلوں کے خلاف ہے۔

انہوں نے اس سلسلے میں مختلف قرآنی آیات اور احادیث کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ انصار برنی نے وفاقی شرعی عدالت کے اس حوالے کے جواب میں کہ جب بھی صحابہ کرامؓ میں کسی بات یا مسئلہ پہ اتفاق نہ ہوتا تھا تو وہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے رجوع فرماتے تھے کہا ہے کہ امہات المومنین کو ایک عام عورت کے ساتھ نہیں ملایا جا سکتا کیونکہ وہ مسلمانوں کی مائیں ہیں۔ جیسا کہ قرآن پاک میں حکم ربی ہے کہ "آنحضرتؐ کی ازواج امت کی مائیں ہیں"۔ ایک اور مقام میں حکم اللہ ہے کہ "اے رسولؐ کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو"۔ ایک اور مقام پہ حکم ہے کہ "رسولؐ کی وفات کے بعد ان کی ازواج سے کوئی شادی نہیں کر سکتا"

اپیل میں کہا گیا ہے کہ "قرآن پاک کے ان احکامات کی روشنی میں وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کو قرآنِ پاک کے خلاف قرار دیا جائے۔ عورت کو قرآن وسنت سے ناقص العقل ہونا بھی ثابت ہے اور قرآن وسنت کے احکامات قیامت تک کے لئے ہیں ان کے علاوہ وفاقی شرعی عدالت نے سنت اور اجماع کے اس اصول کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں دی ہے۔"

---

(۳) غلام اور لونڈیاں

روزنامہ جنگ (لاہور) کی اشاعت بابت ۱۲ فروری ۱۹۸۳ء میں شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنی ایک تقریر میں کہا ہے :-

مالِ غنیمت میں ہاتھ آنے والی لونڈیوں کے بارے میں کئے جانے والے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ حضورؐ کے زمانے میں غلاموں اور لونڈیوں کا معاملہ تھا۔ قرآن میں اس کے خاتمے کی کوئی آیت نہیں۔ لیکن اسلام کے نزدیک غلام بنانا شرک ہے۔ لیکن لونڈیوں کے معاملے میں تمتع کی اجازت ہے۔ نکاح ضروری نہیں لیکن اگر انہیں آزاد کر کے نکاح کر لیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ لونڈیوں سے ہونے والی اولاد کے وہی حقوق ہوں گے جو دوسری بیویوں کے ہونے والی اولاد کو حاصل ہوں گے۔

(۱) قرآن میں غلاموں اور لونڈیوں کے خاتمے کی کوئی آیت نہیں!
اگر انہیں قرآن میں ایسی آیت نظر نہیں آئی تو ان کی نظر کا قصور ہے نہ کہ قرآن کا! اقبالؒ نے سچ کہا تھا کہ —— دیریز ہے تیرا مرضِ کور نگاہی!

(۲) قرآن نے اسے ختم نہیں کیا لیکن اس کے باوجود غلام بنانا شرک ہے! (کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی)۔

(۳) غلام بنانا شرک ہے لیکن لونڈیاں بنانا اور ان سے بغیر نکاح جنسی اختلاط عین مطابقِ اسلام ہے! (صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے)

جس قوم کے "مجتہد" ایسے ہوں اس کا خدا حافظ!

---

(۴) مساجد کی حیثیت

۱۰ اپریل ۱۹۸۳ء کے روزنامہ جنگ میں ایک طویل رپورٹ شائع ہوئی ہے جس کا ملخص حسب

ذیل ہے:۔

کچھ عرصہ قبل شریعت کورٹ نے وفاقی حکومت کے ایک ریفرنس کے جواب میں یہ رائے دی تھی کہ سرکاری اراضی پر بغیر اجازت تعمیر کی ہوئی مسجد کو منہدم کیا جا سکتا ہے۔ مفتی ولی حسن صاحب نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ شریعت کورٹ کا یہ فیصلہ صحیح نہیں۔ اس پر شریعت کورٹ نے انہیں (اور جس اخبار اور جریدہ میں ان کا یہ بیان شائع ہوا تھا) توہینِ عدالت کا نوٹس دیا۔ عدالت نے مقدمہ کی ابتدائی کارروائی کے بعد اسے ۲۵ر اپریل تک کے لئے ملتوی کر دیا۔ مفتی صاحب نے اپنے بیان میں کہا کہ "شرعی عدالت کی حیثیت سے انہیں توہینِ عدالت کے تصور سے اختلاف ہے، کیونکہ اسلام میں توہینِ عدالت کا تصور نہیں"۔ انہوں نے مزید کہا کہ "میرا تعلق دیوبند سے ہے اور علمائے دیوبند نے کبھی معافی نہیں مانگی۔ میں بھی معافی نہیں مانگوں گا"۔

ضمناً۔ مفتی صاحب خود شرعی عدالت کے مشیر فقیہہ ہیں!

۲۱ر اپریل (۱۹۳۸ء) کی یاد میں

تاریخِ پاکستان میں ۲۱ر اپریل، علیم الشان اہمیت کا یادگار دن ہے۔ اگر ہماری قوم احسان فراموش نہ ہوتی، تو وہ اس دن کو اس کے شایانِ شان علمی وجاہت، شان و شوکت، جوش و خروش اور ولولہ و طنطنہ سے مناتی لیکن ہمارے ہاں جس طرح اقبالؒ کا پیغام قوالوں کی نذر ہو چکا ہے اسی طرح اس کی یادیں بھی فراموش شدہ افسانے بنتی جا رہی ہیں۔ طلوعِ اسلام بہر حال، اپنی بساط کے مطابق اس محسنِ ملت کی یادؒ تازہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے بزمِ طلوعِ اسلام گوجرانوالہ نے ۲۱ر اپریل کو "مفکرِ قرآن" پرویز صاحب کے ساتھ ایک شام کی تقریب کا اہتمام کیا۔ یہ تقریب بزم کے نمائندہ چوہدری مقبول شوکت صاحب کے دولت خانہ افشاں سبزہ زار میں نہایت حسین و جمیل انداز سے منائی گئی۔ شہر اور مضافات کے دانشور معززین کا نہایت شائستہ اجتماع تھا جس میں سوال و جواب کے انداز میں اقبالؒ کے تصورِ پاکستان اور اس کے قرآنی نصب العین کو منظرِ عام پر لایا گیا ـــ اس نصب العین کو جسے بڑی کوششوں اور سازشوں سے نگاہوں سے اوجھل کیا جا رہا ہے ـــ بعد ازاں محترم چوہدری صاحب کی طرف سے نہایت پرتکلف چائے سے تواضع کی گئی۔ اس کامیاب تقریب کے لئے بزمِ طلوعِ اسلام گوجرانوالہ بالعموم اور اس کے نمائندہ بالخصوص مستحقِ مبارکباد ہیں۔

(۲) اس سے پہلے ۲۳ر مارچ کی تقریب کو بزمِ طلوعِ اسلام گجرات نے اسی حسین و جمیل انداز سے محترم ڈاکٹر محمد اکرم مرزا صاحب کے بنگلہ پر منایا تھا جنہوں نے چائے کی بڑی جاذب تواضع سے نوازا تھا۔ بزم اور محترم ڈاکٹر صاحب ہمارے پُرخلوص شکریہ کے مستحق ہیں۔

(۳) ۲۲ر اپریل کی صبح پرویز صاحب کا خصوصی درسِ قرآن اسی دن کی یاد سے متعلق تھا۔ درس کا عنوان تھا ـــ حقیقت خرافات میں کھو گئی ـــ ادارہ کا پورا احاطہ صاحبِ ذوق سامعین سے بھرپور تھا۔ قرآن مجید کی تابانیاں، اقبالؒ کا انقلاب آفریں پیغام اور پرویز صاحب کا حسنِ خطابت جب یک جا ہو جائیں تو فضا کی سحر آفرینی ناقابلِ بیان ہو جاتی ہے۔ یہ خصوصی درس آئندہ صفحات میں پیشِ خدمتِ قارئین ہے۔

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

جتنے مقامی بزم ہائے طلوع اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈرز کے ذریعے حسب ذیل مقامات اور اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے :-

نوٹ :- پرویز صاحب کے درس کے دوران ہی متعدد دوسری کیسٹیں اور ٹیپیں بزموں کے لئے ریکارڈ کر لئے جاتے ہیں -

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام درس کے کوائف :-
لاہور	جمعہ ۹ بجے صبح	۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۸۰۸۰۰
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲ بجے دوپہر	76, PARK ROAD, ILFORD. TEL: 553-1896
برمنگھم (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار دو بجے دوپہر	(بمقام) 227/229 ALUMROCK ROAD B8 3BH,
اوسلو (ناروے)	ہر ماہ کا پہلا اتوار سہ پہر/شام ۲ بجے	(بمقام) MR MANZOOR AHMAD, DOVRE GATE-7/OSLO-1 بذریعہ V.C.R
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	335 DRIFTWOOD AVE #311, DOWNS VIEW, TORONTO (NORTH YORK) (ONT): M3N-2P3. PHONE (416) 661-2827
کراچی صدر	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	بذریعہ V.C.R. دار المتبصرہ (بالائی منزل) بالمقابل شاپ نمبر ۲ ۔ سرسید روڈ
پشاور	۱۔ ہر جمعہ ۵ بجے شام ۲۔ ہر جمعہ ۹ بجے صبح	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب ۔ رفیق لین صدر (OPP: VIP. MAINGATE) پشاور کینٹ بازہ روڈ فون ۴۲۷۵۹ ثریا محل 3-B ۔ یونیورسٹی ٹاؤن
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف ۔ محمود علی صاحب ۔ اتفاق بلڈنگ نواب علی روڈ
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی ۔ ۱۶۶ لیاقت روڈ
لیہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر مکینیکل انجینئرنگ ورکس ۔ شہید روڈ (لیہ)
ایبٹ آباد	۱۔ ہر جمعہ ۴ بجے سہ پہر ۲۔ ہر اتوار ۴ بجے سہ پہر	رہائش گاہ صلاح الدین صاحب ۔ واقع L-K-234 کیال (ایبٹ آباد) رہائش گاہ غلام مصطفٰے (اعوان صاحب) واقع K-366 ۔ کنج گرائی نمبر ۱ (ایبٹ آباد)
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واڑ سیلاٹی مکان نمبر ۴ ۔ نظامی منزل
بہاولپور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفاخانہ ۔ غنی پورہ باہتمام (ڈاکٹر ہومیو) محمد اعظم خان صاحب ۔
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر توغی روڈ ۔ باہتمام غلام صابر صاحب
گوجرانوالہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم ملحق رہائش گاہ : چوہدری مقبول شوکت ۔ گل روڈ ۔ سول لائنز
گجرات	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ و ہر اتوار ۴ بجے سہ پہر	بمقام ۱۲/بی ۔ کچہری روڈ ۔ ۔ ۔ ۔ باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)
ملتان	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ (فون : ۳۱۰۷۱)
مجلس تحصیل کبیروالا ملتان	ہر جمعہ ۴ بجے سہ پہر	بمقام ۔ مطب حکیم احمد دین صاحب (نمائندہ بزم)
ہنگو	ہر جمعہ ۵ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون ۔۔)
فیصل آباد	ہر جمعہ ۲ بجے دوپہر	بمقام [illegible]

ادارۂ طلوعِ اسلام کی

مطبوعات کی قیمتیں

(مئی ۱۹۸۳ء)

نوٹ:- اِن قیمتوں میں ڈاک اور پیکنگ کا خرچ شامل نہیں

نام کتاب	قیمت
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ کھلے پارے)	۱۵۰/- روپے
پارہ نمبر ۱ و ۳۰ (فی پارہ)	۶/-
پارہ نمبر ۲ تا ۲۹ (")	۵/-
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ - مجلد)	۱۸۰/-
(تین جلدوں میں) فی جلد	۶۰/-
لغات القرآن (مکمل سیٹ - مجلد)	۲۰۰/-
(چار جلدوں میں) فی جلد	۵۰/-
مطالب الفرقان (جلد اوّل)	۷۵/-
مطالب الفرقان (جلد دوم) (تازہ ایڈیشن)	۷۵/-
مطالب الفرقان (جلد سوم)	۷۵/-
مطالب الفرقان (جلد چہارم)	۹۰/-
مطالب الفرقان (جلد پنجم)	۷۵/-
تصوّف کی حقیقت	۷۵/-
نظامِ ربوبیت (جدید ایڈیشن)	۵۰/-
قرآنی قوانین (جدید ایڈیشن)	۲۵/-
اسلام کیا ہے (تازہ ایڈیشن)	۴۵/-

نام کتاب	قیمت
	روپے
جوئے نور	۳۵/-
شعلۂ مستور	۳۵/-
جہانِ فردا	۳۵/-
کتاب التقدیر	۲۵/-
معراجِ انسانیت	۶۰/-
شاہکارِ رسالت (تازہ ایڈیشن)	۷۵/-
اقبالؒ اور قرآن	۳۵/-
انسان نے کیا سوچا؟	۷۵/-
مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں	۱۵/-
حسنِ کردار کا نقشِ تابندہ (اعلیٰ ایڈیشن)	۱۰/-
ISLAM A CHALLENGE TO RELIGION	
مجلّد (H.B.)	۶۰/-
کارڈ بورڈ (P.B.)	۵۰/-
سلیبل	۲۰/-
فردوسِ گم گشتہ	۲۰/-

نام کتاب	قیمت
	روپے
ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت (مجلّد)	۱۵/-
سلیم کے نام خطوط (جلد اوّل، دوم، سوم) (مکمل سیٹ)	۷۵/-
طاہرہ کے نام خطوط	۱۰/-
مقامِ حدیث	۱۰/-
اسلامی معاشرت	۶/-
قرآنی فیصلے (مکمل ۵ جلدیں)	۶۵/-
(پہلی تین جلدیں، ہر جلد -/۱۰ روپے) (چوتھی جلد -/۱۵ روپے) جلد پنجم -/۲۰ روپے	
اسبابِ زوالِ اُمت	۵/-
عربی خود سیکھئے	۱۰/-
پاکستان کا معمارِ اوّل	۵/-
فجر الاسلام (مکمل دو جلدیں۔ فی جلد -/۸)	۱۶/-
منزل بمنزل	۱۵/-
پرنسپل آف لا میکنگ اِن اسلام (انگریزی)	۵/-
قائدِ اعظمؒ اور طلوعِ اسلام	۴/-

نام کتاب	قیمت
	روپے
قتلِ مرتد اور غلام اور لونڈیاں	۵/-
تاریخ الامت (مکمل سیٹ ۸ جلدیں)	۴۰/-
حسبِ ذیل کتب کا سابقہ ایڈیشن ختم ہو گیا ہے تازہ ایڈیشن چھپنے پر اعلان کیا جائے گا۔	
ابلیس و آدم۔ من و یزداں۔ برقِ طور۔ جہاد۔ بہارِ نو۔ الفتنۃ الکبریٰ۔ تبویب القرآن	
تصنیفات (انگریزی)	
ڈاکٹر سید عبد الودود صاحب:۔	
PHENOMENA OF NATURE & QURAN (H.B)	۷۵/-
CONSPIRACIES AGAINST QURAN (H.B)	۶۰/-
FOOD AND HYGIENE IN ISLAM (P.B)	۸/-
THE HEAVENS THE EARTH AND THE QURAN	۷۵/-

ماہنامہ طلوعِ اسلام کا سالانہ چندہ:۔

اندرونِ ملک پاکستان -/۲۶ روپے

غیر ممالک بذریعہ بحری ڈاک رجسٹرڈ -/۸۶ روپے

غیر ممالک بذریعہ ہوائی ڈاک رجسٹرڈ:۔

۱۔ یورپ کے ممالک (برطانیہ، فرانس، سوئٹزرلینڈ وغیرہ) .. .. .. -/۱۳۶ روپے

۲۔ عرب ممالک (دوبئی، بحرین، کویت، سعودی عرب وغیرہ) .. .. -/۱۱۶ "

۳۔ افریقہ کے ممالک (لیبیا، کینیا، یوگنڈا، مصر، جنوبی افریقہ وغیرہ) .. .. -/۱۳۱ "

۴۔ امریکہ، کینیڈا وغیرہ .. -/۱۹۶ روپے۔ (۵) نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، جزائر فجی وغیرہ .. -/۱۸۱ "

۶۔ انڈیا، برما، سری لنکا، جزائر مالدیپ وغیرہ .. -/۱۲۱ روپے۔ (۷) بنگلہ دیش -/۱۳۶ "

نوٹ: ماہنامہ طلوعِ اسلام کے لئے صرف، ادارہ طلوعِ اسلام کو لکھیے۔

کتابیں ملنے کے پتے } (۱) ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵۔ بی گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبۂ دین و دانش۔ چوک اُردو بازار۔ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

بیادِ اقبالؒ

حقیقت خرافات میں کھو گئی

یہ اُمت روایات میں کھو گئی

بتقریب یومِ اقبالؒ (۲۲ر اپریل ۱۹۸۳ء)

پرویز صاحب کا خصوصی درس

حقیقت خرافات میں کھو گئی

(پرویز)

عزیزانِ گرامی قدر! سلام و رحمت!

آج کل سڑکوں پہ بجلی کے قمقمے آویزاں ہوتے ہیں۔ پاور ہاؤس میں بیٹھا ہوا الیکٹریشن ایک بٹن دباتا ہے تو سارے قمقمے بیک وقت روشن ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے بچپن کے زمانے میں سڑکوں پہ مٹی کے تیل سے جلنے والی لیمپیں ہوتی تھیں۔ لیمپیں جلانے والا، ایک ایک لیمپ روشن کرتا چلا جاتا۔ وہ اپنے حلقہ کا آخری لیمپ جلا کر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا اور اس کی جلائی ہوئی لیمپیں رات بھر راستوں کو روشن کئے رکھتیں۔ تاریخِ انسانیت عبارت ہے اسی قسم کے لیمپ جلانے والوں سے جن کے نورِ بصیرت اور حسنِ کردار سے روشن شدہ شمعوں سے انسانی زندگی کی گذرگاہیں فروزاں ہیں۔ وہ ان شمعوں کو اپنے زمانے کے لئے نہیں جلاتے تھے ۔ وہ تو انہیں جلا کر آگے بڑھ جاتے تھے اور ان کے بعد آنے والوں کی راہیں ان سے مستنیر ہوتی تھیں۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ:

قدم قدم پہ جلاتا ہوں خونِ دل کے چراغ — یہ سوچ کر کوئی پیچھے بھی آ رہا ہو گا

انہی، خونِ جگر سے شمعیں روشن کرنے والوں میں ایک تابندہ و درخشندہ نام حکیم الامت علامہ اقبال (رحمۃ اللہ علیہ) کا بھی ہے جن کے یومِ وفات کی یاد تازہ کرنے کے لئے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ حضرت علامہؒ کا سب سے پہلے عمومی احسان، عالمگیر انسانیت پہ ہے جس کی تاریک راتوں کو انھوں نے نورِ سحر سے روشناس کرایا۔ دوسرا احسان ملتِ پاکستانیہ پہ ہے جس کے راہ گم کردہ قافلے کو انہوں نے نشانِ منزل عطا کیا۔ اور ایک ذاتی احسان اس ذرۂ ناچیز پہ بھی ہے جس کا فہمِ قرآن اُن کے نورِ بصیرت کا ادنیٰ کرم ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج آپ اسے کسی سائیں بلّھے شاہ کے مزار پہ دھونی رمائے بیٹھا دیکھتے۔

ملّت کا درد

علامہ اقبالؒ کا قلب حزینِ ملت کے درد سے بھرپور تھا۔ ان کی ساری عمر اسی کے غم کی خونناب فشانی میں گذری۔ ان کا سارا کلام اسی سوز و ساز، درد و داغ کی داستانِ خوں چکاں ہے۔ دیکھئے! وہ ارمغانِ حجاز کی ایک سادہ سی نظم میں پہلے ملت کی زبوں حالی پہ کس طرح خون کے آنسو روتے ہیں جب کہتے ہیں کہ

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے — کھویا گیا کس طرح ترا جوہرِ ادراک؟

کس طرح ہوا کند ترا نشترِ تحقیق؟ — ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک؟

تو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزاوار　　کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلامِ خس و خاشاک؟
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں ؟　　کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک ؟
اب تک ہے رواں گرچہ لہو تیری رگوں میں　　نے گرمیٔ افکار، نہ اندیشۂ بے باک !

یہاں تک تو اُمتِ مرحوم کی کیفیت و زبوں حالی کا مرثیہ تھا۔ اس کے بعد چار لفظوں میں اس کے اسباب کو اس حسنِ ایجاز و جامعیت سے مرتکز کر دیا ہے کہ ہماری ساری تاریخ اس میں سمٹتی کرتا جاتی ہے۔ فرمایا :–

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری !　　اے کشتۂ سلطانی و مُلائی و پیری !

دوسری جگہ ہے

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر　　سود خوار و والی و مُلّا و پیر

چار بلائیں

ان کے نزدیک یہی وہ چار عفاریت ہیں۔ جنہوں نے اُمت کے جسمِ ناتواں سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا ہے۔ یعنی ملوکیت۔ نظامِ سرمایہ داری۔ خانقاہیت اور مُلّائیت ! ان کا کلام انہی چار امراض کی تشریح، اور ان کا پیغام انہی سے جان چھڑانے کی تلقین ہے۔ میں آج کی نشست میں ان کے صرف ایک گوشے۔ یعنی مُلّائیت۔ کی اقبالی تشریحات و تنقیدات پیش کروں گا۔ لیکن پہلے دو امور کا تمہیداً سمجھ لینا ضروری ہے۔

(۱) آپ تاریخِ انسانیت کا پہلا صفحہ اُلٹئے۔ آپ کو ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی استبدادی قوتیں شانہ بشانہ چلتی نظر آئیں گی۔ جہاں تک تسلط و تغلب کا تعلق ہے، یہ دونوں قوتیں یکساں دکھائی دیں گی لیکن حکمران طبقہ کے مقابلہ میں مذہبی پیشوائیت کی زنجیریں زیادہ محکم اور سنگین ہوتی ہیں۔ حکمرانوں (بادشاہوں۔ راجاؤں) کو اپنا غلبہ و تسلط قائم رکھنے کے لئے پولیس اور فوج کی ضرورت ہوتی ہے لیکن مذہبی پیشوائیت کو ان میں سے کسی کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ اس لئے کہ حکمرانوں کا تسلط محکوموں کے جسم پر ہوتا ہے اور مذہبی پیشوائیت کا تغلب ان کے قلب اور دماغ پر۔ حکمرانوں کے خلاف سرکشی کے خیالات ذہنوں میں اُبھرتے اور بعض اوقات بغاوت کی شکل بھی اختیار کر لیتے ہیں لیکن مذہبی تسلط کا یہ عالم ہے کہ اگر ان کے کسی حکم کے خلاف کسی کے دل کی گہرائیوں میں شائبہ تک بھی کروٹ لے، تو وہ ڈرتا ہے۔ روتا ہے، گڑگڑاتا ہے۔ معافیاں مانگتا ہے۔ منتیں مانتا ہے۔ کفارے ادا کرتا ہے۔ "نادیدہ خوف" اس کے اعصاب پر ایسی کڑی گرفت رکھتا ہے کہ وہ سر اُٹھانے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا۔

ملکی حکمرانوں اور مذہبی پیشواؤں کے غلبہ اور خوف کی ایک بیّن مثال حال ہی میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ گذشتہ فروری میں، قانونِ شہادت کے خلاف، کچھ خواتین نے احتجاجی جلوس نکالا۔ حکومت نے اسے خلافِ قانون قرار دے کر مواخذہ کیا۔ بعض گرفتاریاں بھی عمل میں آئیں۔ لیکن انہوں

فتویٰ کی گرفت

نے اسے ہنسی خوشی برداشت کر لیا۔ نہ کسی کی آنکھ میں آنسو آئے۔ نہ دل میں دھڑکن پیدا ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد اخبارات میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی :-

جمعیت العلماء جموں و کشمیر کے مرکزی ڈپٹی چیف آرگنائزر مولانا عبدالرزاق چشتی نے فتویٰ دیا ہے کہ قانونِ شہادت کے خلاف حال ہی میں لاہور میں نکالے جانے والے جلوس میں جن شادی شدہ خواتین نے حصہ لیا ہے ان کے نکاح ٹوٹ گئے ہیں۔ اب انہیں جائز تصور نہیں کیا جانا چاہئے۔ مولانا نے ایسی خواتین کے شوہروں کو ہدایت کی ہے کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ نکاح کی تجدید کے لئے شرعی طریق کار اختیار کریں۔ ایک بیان میں مولانا چشتی نے کہا کہ جن خواتین نے جلوس میں شرکت کی ہے انہوں نے خدا اور قانون پاک کی تعلیمات کی خلاف ورزی کی ہے۔ کیونکہ انہوں نے ایک مقدس قانون کو چیلنج کیا ہے۔ چنانچہ ان کے نکاح جائز نہیں رہے[1]۔ اس کے ساتھ ساتھ مولانا نے کہا کہ جن سیاسی جماعتوں نے اجتماعی اور افراد نے نجی طور پر عورتوں کی حمایت میں جلوس میں شرکت کی ہے، وہ بھی خدا اور اس کے رسولؐ کے مجرم ہیں۔ انہوں نے مذہبی تعلیمات کی توہین کی ہے، اس لئے وہ پھانسی کے مستحق ہیں۔

(جنگ۔ لاہور۔ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۸۳ء)

سنا گیا ہے کہ جن عورتوں کے خلاف یہ فتویٰ صادر ہوا، ان میں سے جو زیادہ "مذہب زدہ" تھیں، ان کا برا حال تھا۔ ڈر کے مارے ان کا رنگ زرد تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ جسم پر لرزہ طاری تھا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ ڈری، سہمی ہوئی پوچھتی تھیں کہ اب کیا ہوگا؟

یہ ہوتا ہے مملکتی حکمرانی اور مذہبی پیشوائیت کی حکمرانی میں فرق!

یہ تو پھر بھی ایک ہنگامی حادثہ تھا۔ یہاں آئے دن ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں کہ کسی زود رنج خاوند نے غصہ میں آکر بیوی کو "طلاق۔ طلاق۔ طلاق" کہہ دیا۔ غصہ فرو ہونے پر مولوی صاحب سے پوچھا کہ اب کیا ہوگا؟ انہوں نے فرمایا کہ تمہاری بیوی پر طلاق پڑ گئی ہے۔ سہمے ہوئے کہا۔ کہ حضرت! اس کے ازالہ کی کوئی صورت؟ فرمایا کہ ایک صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ تمہاری بیوی کسی غیر مرد کے ساتھ نکاح کر کے ایک رات اس سے ہم بستر ہو۔ صبح کو وہ اسے طلاق دے دے۔ پھر وہ تم سے از سرِ نو نکاح کر لے تو تم میاں بیوی کی زندگی بسر کر سکتے ہو۔ ورنہ نہیں۔ بال، بچوں بلکہ بعض اوقات "دودھ۔ پوت" والی بڑھیا بیوی کانپ اٹھتی ہے کہ یہ کیسے ہوگا؟ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ غصہ میں حماقت تو اس کے خاوند سے سرزد ہوئی۔ یہ سزا اسے کیوں مل رہی ہے؟ لیکن مولوی صاحب گرج کر فرماتے ہیں کہ یہ شریعتِ حقہ کا حکم ہے۔ اس کے خلاف

---

[1] امید ہے آئندہ، خواتین محتاط رہیں گی اور صرف غیر شادی شدہ عورتوں کا جلوس نکالا کریں گی۔

چون و چرا نہیں کی جا سکتی۔[1] آپ سوچئے کہ کسی دنیاوی حکومت کی گرفت اس قدر اعصاب شکن ہو سکتی ہے؟ اس قسم کا ہوتا ہے مذہبی پیشوائیت (تھیاکریسی) کی حکومت کا تسلط!

(۲) اور یہی وجہ ہے جو خود ملوکیت کو بھی مذہبی پیشواؤں کی تائید کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جب تک برہمن، کھشتری (راجہ) کے ماتھے پر اپنی توثیق کا ٹھپہ (ٹیکہ) نہ لگا دے وہ گدی پر براجمان نہیں ہو سکتا۔ جبتک پادری بادشاہ کے سر پہ مقدس پانی کا چھینٹا نہ دے دے، وہ جائز حکمران تسلیم نہیں کیا جاتا۔ جب تک مفتیانِ کرام سلطان المعظم کے ظل اللہ علی الارض (زمین پہ خدا کا سایہ) ہونے کا اعلان نہ کر دیں، وہ "خلیفۃ اللہ فی الارض" قرار نہیں پا سکتا۔ یہ (ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا) گٹھ جوڑ ہے جو حکمرانی کے شکنجے کو مستحکم رکھتا ہے۔

بعثتِ نبی اکرمؐ کے وقت غلامی کے ان بندھنوں کی یہی حالت تھی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

بود انسان در جہاں انساں پرست ناکس و نابود مند و زیر دست

زیر دست انسان بالادستوں کی غلامی کے شکنجوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کی اپنی نہ کوئی ہستی تھی، نہ وجود، نہ تشخص تھا نہ مقام:-

سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش بندھا در دست و پا و گردنش

قیصر و کسریٰ (ملوکیت) اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر، اسے لوٹنے میں مصروف تھی:-

کاہن و پاپا و سلطان و امیر بہرِ یک نخچیر صد نخچیر گیر

ایک طرف قیصر و کسریٰ اور سلطان و امیر اور دوسری طرف مذہبی پیشوا — ایک شکار کے پیچھے سینکڑوں شکاری:-

از غلامی فطرتِ او دوں شدہ نغمہ ہا اندر نے او خوں شدہ

صدیوں کی غلامی سے اس کی فطرت پست ہو چکی تھی۔ اس کی رگوں میں خونِ زندگی منجمد ہو گیا تھا۔ اس میں نہ حرکت باقی رہی تھی نہ حرارت۔ وہ جیتا جاگتا انسان نہیں، مسخ شدہ لاش بن کر رہ گیا تھا۔

یہ تھی انسان کی حالت ظہورِ اسلام کے وقت۔ قرآن آیا اور اس نے نوعِ انسان کی غلامی کے ایک ایک بندھن کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا۔ اس نے ملوکیت کی زنجیروں کو توڑا تو اس کیساتھ ہی اس مذہبی پیشوائیت کے حلقہ ہائے زنار بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ قرآن نے اعلان کر دیا کہ یاد رکھو! یہ احبار و رہبان، لوگوں کا مال ناجائز طور پہ کھا جاتے ہیں۔ انہوں نے مذاہب کو کاروبار بنا

[1] واضح رہے کہ یہ خدا کا حکم نہیں، انہی حضرات کی خود ساختہ "شریعت" کا فیصلہ ہے۔

رکھا ہے۔ یہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ ہم، خدا کی طرف لے جانے والے راستے کی طرف تمہاری راہ نمائی کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ يَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ (۹ھ) خدا کی طرف جانے والے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ خود ہیں۔ یہ اور سرمایہ دار دونوں جہنم کا ایندھن ہیں

اس طرح اس نے نوعِ انسان کو غلامی کی ان تمام زنجیروں سے رہائی دلا دی ؎

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست نقش ہائے کاہن و پاپا شکست

دورِ ملوکیت

انسانی حریت و آزادی کا یہ سلسلہ اسوقت تک باقی رہا جب تک قرآنی نظام مملکت قائم رہا۔ اس کے بعد خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی اور ملوکیت کے ساتھ ہی اس کے لازم عناصر —— سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت بھی وجود پذیر ہوگئے۔ خود مسلمانوں نے ملوکیت کے تختوں اور مذہبی پیشوائیت کی مسندوں کے ان ٹکڑوں کو جنہیں انہوں نے ابھی کچھ عرصہ پہلے توڑ کر پھینک دیا تھا۔ اپنی مژگانِ عقیدت سے ایک ایک کرکے چُنا اور اپنی منہدم کردہ مسندوں کو بار دیگر استوار کرکے ان پر متمکن ہو کر بیٹھ گئے۔ آسمان کی آنکھ نے اس سے زیادہ حیرت انگیز نظارہ کہیں نہیں دیکھا ہوگا کہ: ؎

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

اس طرح سلاطین، اقتدارِ مملکت بزورِ شمشیر یا وراثتاً حاصل کرکے تختِ حکومت پر متمکن ہوگئے، اور علماء حضرات برسرِ منبر ان کے حق میں نصرتِ خداوندی کی دعائیں مانگتے رہے، اور ان کی قصیدہ خوانی اور چاپلوسی میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ: الیافعی کی تاریخ کے مطابق خلیفہ یزید بن عبد الملک کے عہد میں، چالیس شیوخ نے آکر گواہی دی کہ:-

خلفاء قیامت کے دن بغیر حساب کے بخشے جائیں گے

(تاریخ یافعی صہ ۲۴۳۔ بحوالہ طلوع اسلام۔ جولائی ۱۹۹۶ء)

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے، مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) نے لکھا تھا کہ:-

اُنہی دنوں محدثین کا ایک بڑا گروہ پیدا ہوگیا تھا جس نے اس عقیدہ کو اپنا دین بنا لیا تھا۔ چنانچہ ابوبکر جصاص اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ان لوگوں کا اس کے ساتھ یہ بھی خیال تھا کہ ظلم و جور، اور بے گناہ لوگوں کے قتل وغیرہ افعال کا صدور بادشاہِ وقت سے اگر ہو تو اس کے خلاف آواز بلند کرنا شرعاً صحیح نہیں۔ ہاں بادشاہ کے سوا عوام کو ٹوکنا درست ہے۔ اور وہ بھی صرف زبان کی حد تک۔ ہتھیار تو بہر حال کسی کے مقابلہ میں اٹھانا شرعاً جائز نہیں۔

(احکام القرآن۔ جصاص۔ جلد دوم۔ صہ ۳۹۔ بحوالہ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی۔ صہ ۵۴)

جاہ پرستی کچھ آج ہی کے مذہبی پیشواؤں کا شیوہ نہیں۔ اقتدار اور قصیدہ خوانی کا چولی دامن کا

ساتھ چلا آ رہا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس سارے دَور میں کوئی بھی اللہ کا بندہ ایسا نہیں ہوگا جس نے اس کے خلاف آواز اٹھائی ہو لیکن جیسا کہ ہر مستبد نظام میں ہوتا ہے، ان کی آواز چھوڑ، ان کے آثار تک کو مٹا دیا گیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہمارے ہاں ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی تاریخ تو پوری تفاصیل کے ساتھ انبار در انبار موجود ہے، لیکن ان کے خلاف آواز اٹھانے والوں کا نام تک بھی کہیں نہیں ملتا۔

ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ ان سلاطین میں کوئی نیک سیرت نہیں تھا۔ لیکن جب ملوکیت کا نظام ہی خلافِ قرآن تھا تو کسی بادشاہ کے انفرادی طور پر نیک ہونے سے وہ نظام تو اسلامی نہیں ہو جاتا۔ ہماری ہزار سالہ تاریخ میں یہ خلافِ اسلام نظام مسلسل اور متواتر جاری رہا۔ یہ سعادت ہمارے زمانے کے حصے میں لکھی تھی کہ اس میں ملوکیت، اور اس شجرۃ الزقوم کے برگ و بار (نظامِ سرمایہ داری، خانقاہیت اور مُلّائیت) کے خلاف بھرپور آواز بلند ہوئی۔ یہ آواز تھی، حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی، جس نے کہا تھا کہ:

مرے گلو میں ہے اک نغمہ جبریل آشوب
سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لئے

لیکن اُس کے دردِ دل نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اس صورِ اسرافیل کو اسی جہانِ کون و مکان میں پھونکے۔ اس نے ایسی بھرپور آواز میں، جس سے یہ چارسو لرز اٹھے پکار کر کہا کہ:-

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است نظامش خام و کارش ناتمام است
غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم کہ در دینش ملوکیت حرام است (ارمغانِ حجاز صفحہ ۱۲۶)

دنیا میں انسان ابھی تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے۔ اگرچہ غلامی کی شکل بدل گئی ہے۔ اسے ابھی تک کوئی انسانیت ساز نظام میسّر نہیں آیا۔ میں اُس شاہنشاہِ بوریہ نشین و گیتی پناہ کے در کا غلام ہوں، جس نے اعلان کیا کہ اس کے نظام کی رُو سے ملوکیت حرام ہے۔ اس نے غلامی کی ہر زنجیر کو توڑ دیا۔

اقبالؒ نے اس ایک نعرۂ مستانہ سے، ہماری تاریخ اور اس کے مضمرات کی، جسے ہم خود فریبی یا ابلہ فریبی کی بنا پر اسلامی تاریخ کہتے چلے آ رہے تھے، اور اب تک یہی کہہ رہے ہیں، حقیقت بے نقاب کر کے رکھ دی۔ مَیں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ آج کی نشست میں میرا یہ موضوع نہیں۔ میرا موضوع مذہبی پیشوائیت ہے جس کی طرف مجھے زود پلٹ آنا چاہیئے۔

مُلّا سے مُراد

لیکن پہلے ایک اہم نقطہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ علامہ اقبالؒ (یا خود میں) جب مُلّا پر تنقید کرتے ہیں تو اس سے کسی خاص فرد یا افراد کے گروہ کی تنقیص یا (خدا نکردہ) تحقیر مقصود نہیں ہوتی۔ مُلّا یا مُلّاازم درحقیقت ایک انسٹی ٹیوشن، ایک

نظام، ایک مسلک کا نام ہے (جیسے عیسائیت میں چرچ یا ہندومت میں برہمنیت) اس مسلک کا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ اسلاف سے چلا آ رہا ہے وہ اسلام میں سند و حجت، قولِ فیصل اور حرفِ آخر ہے۔ وہ ابدی ہے اور غیر متبدل۔ نہ اس پر تنقید کی جا سکتی ہے، نہ کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ۔ وہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ وہ ممکن العمل ہو یا نہ۔ اسلام بہر حال وہی ہے۔ اس سے اختلاف مستوجبِ سزا ہے۔ اور انکار کفر کے مرادف جس سے مسلمان مرتد ہو جاتا ہے اور مرتد کی سزا موت ہے۔ یہ ہے وہ مسلک و مشرب جس کی اقبالؒ مخالفت کرتا ہے کیونکہ اس قسم کے مسلک کی نہ اسلام میں گنجائش ہے نہ جواز۔ اسلام سے مراد ہے کتاب اللہ کی راہ نمائی میں علم و عقل سے کام لینا، اور مذہبی پیشوائیت کے مسلک میں نہ کتاب اللہ کا کوئی عمل دخل ہوتا ہے نہ علم و عقل سے کچھ واسطہ۔ علم و عقل سے اسے کس قدر واسطہ ہوتا ہے، اس کے لئے صرف ایک مثال پیش کر دینا کافی ہوگا۔ کچھ عرصہ اُدھر کی بات ہے:-

> سعودی عرب کے شہر مدینہ منورہ کی اسلامی یونیورسٹی کے صدر نے اعلان کیا کہ زمین ایک جگہ پر قائم ہے اور سورج اس کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے خلاف تصور کرے تو اسے پھانسی پر لٹکا دینا چاہئے۔ سعودی عرب ہی کی ایک اخبار میں صدر یونیورسٹی شیخ عبدالعزیز بن باز کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ چاہے کتنی ہی تاخیر کیوں نہ ہو گئی ہو لیکن اب بھی اگر لوگوں کو صحیح راستے پر لایا جائے۔ تو کوئی ہرج نہیں۔ ہر روز انسان خود دیکھتے ہیں کہ زمین اپنی جگہ ساکت ہے اور سورج اس کے گرد گردش کر رہا ہے۔ طلوع ہوتا ہے اور پھر غروب ہوتا ہے۔ آپ نے مزید لکھا کہ آج کے دعوے کے بموجب زمین اگر گردش کرتی ہوتی تو پھر شہر، درخت، پہاڑ، دریا اور سمندروں میں استقامت نہ ہوتی۔ اگر زمین گردش کرنے لگے تو مشرق کے شہر مغرب میں اور مغرب کے شہر مشرق میں دیکھنے لگیں گے۔ (بحوالہ طلوع اسلام، اگست ۱۹۶۶ء)

اقبال مُلّا ازم کے اسی مسلک پر تنقید بھی کرتا ہے اور بعض مقامات پر اس میں اور حقیقی اسلام میں تقابل بھی۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ صدرِ اوّل کے بعد، ہماری تاریخ، ملوکیت کی تاریخ ہے جو اسلام کی نقیض ہے۔ ظاہر ہے کہ جو نظام ہی اسلام کی نقیض ہو اس میں جو کچھ اسلام کے نام سے ہوگا اسلام کی نقیض ہوگا۔ اقبالؒ نے اپنے کلام میں، غیر اسلامی عقاید، نظریات، تصورات، مسالک و مشارب کے لئے "عجمی اسلام" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ وہ مذہبی پیشوائیت کے مروجہ اسلام پر تبصرہ کرتے ہوئے۔ کہتے ہیں:-

تمدن، تصوف، شریعت، کلام بتانِ عجم کے پجاری تمام

بھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب — مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا — لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا
حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ اُمت روایات میں کھو گئی

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے!

اشھد ان لا الٰہ الا اللہ

ساری دُنیا کی مساجد میں مؤذن، دن میں پانچ مرتبہ، مینارۂ مسجد پر یا لاؤڈ سپیکر کے سامنے کھڑے ہو کر، باآوازِ بلند اعلان کرتا ہے کہ:۔

اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

وہ یا تو ساری عمر ان الفاظ کو بلا سمجھے دُہراتا رہتا ہے۔ اور اگر سمجھتا ہے تو یہ کہ خدا کے سوا کسی کی پرستش نہیں ہو سکتی۔ اسے الٰہ کے یہی معنی بتائے گئے ہیں۔ لیکن جب اسلام ایک زندہ حقیقت تھا تو الٰہ کے معنی تھے، صاحبِ اقتدار، وہ جسے حقِ حکومت حاصل ہو۔ مؤذن اعلان یہ کرتا تھا کہ اے اہلِ دنیا! کان کھول کر سُن لو کہ:۔

میں اس حقیقت کی شہادت دیتا ہوں کہ انسانوں پر حکومت کا حق کسی انسان کو حاصل نہیں۔ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ یہ کس قدر زلزلہ انگیز اور انقلاب خیز اعلان ہے جو ساری دُنیا کے در و دیوار کو ہلا دیتا ہے۔ پھر اسے بھی سوچئے کہ شہادت یا گواہی تو اسی کی قابلِ اعتماد ہو سکتی ہے جو اپنا آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہا ہو۔ وہ (مؤذن) جس مقام پر کھڑا اعلان کر رہا ہے کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کسی کو حقِ حکومت حاصل نہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ (کم از کم جہاں تک میری نگاہ جاتی ہے) حکومت صرف خدا کی قائم ہے۔ کسی انسان کی نہیں ۔۔۔ اور یہ اعلان ساری دُنیا میں قدم قدم پر ہو رہا ہوتا ہے۔ یہ تھا اذان کے سب سے پہلے جزو کا مفہوم حقیقی اسلامی نظام کے زمانے میں۔ اس مفہوم کا ملوکیت کے لئے قابلِ قبول ہونا تو ایک طرف، وہ اسے خود سُن سکتی تھی نہ اس کی اجازت دے سکتی کہ کوئی اور بھی اسے سُن پائے۔ مشکل اس کی یہ تھی کہ وہ ان الفاظ کو تبدیل بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس مشکل کا حل مذہبی پیشوائیت نے مہیا کر دیا۔ اس کیلئے الٰہ کا ترجمہ کر دیا، "وہ جس کی پرستش کی جائے"۔ اب یہ اعلان بالکل بے ضرر ہوگیا مذہبی پیشوائیت کرتی ہی یہ ہے۔ وہ الفاظ تو وہی رہنے دیتی ہے۔ ان کا مفہوم بدل دیتی ہے۔ اقبالؒ نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن — مُلا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں — کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

ضمناً۔ اقبالؒ نے جو کہا ہے کہ "الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں" تو یہ صحیح نہیں۔ الفاظ میں تو بے شک تفاوت نہیں۔ لیکن یہ معانی کا تفاوت ہی تو ہے جو مُلّا کی اذان، اور مجاہد کی اذان میں فرق پیدا کرتا ہے۔ وہ دوسری جگہ کہتے ہیں

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے — شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل — یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات

وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

لیکن یہ بھی اقبالؒ کی خوش فہمی تھی جو کہا تھا کہ "شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات"! مُلّا کے دل میں قرآن کی بات اتر ہی نہیں سکتی۔ خود ارشادِ خداوندی ہے کہ لَّا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ [1] (۵۶/۷۹)۔ قرآن کے مطالب و مقاصد تک اسی کی رسائی ہوگی جو دل و دماغ کو تمام غیر قرآنی خیالات و معتقدات سے پاک و صاف کرکے اس کی طرف آئے۔ اسی کو توحید کہتے ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں

توحید

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے — ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے!
وہ رمزِ شوق جو پوشیدہ لَآ اِلٰہ میں ہے — طریقِ شیخ فقیہانہ ہو تو کیا کہیے!

توحید کے مقابلہ میں "سب سے بڑے بت" فرقہ پرستی کے ہیں جسے قرآن نے شرک کہہ کر پکارا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہر فرقہ کے اسلام کی انتہا کسی نہ کسی شخصیت پہ جا کر ہو جاتی ہے۔ اور یہی شخصیت پرستی، توحید کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جو شخص بھی کسی فرقے کے ساتھ متمسک ہے، اس کی قرآن تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ جب تک ان بتوں کو کعبۂ ذہن سے نکال باہر نہ کیا جائے، خدا اس کے اندر قدم نہیں رکھتا۔ یہ حقیقت ہے کہ:—

کھو دیا گیا جو مطالب اعتقاد و روایت میں — سمجھے گا نہ تو جب تک بے رنگ نہ ہو ادراک

بے رنگیٔ ادراک ہی کو اِلَّا الْمُطَهَّرُونَ کہا گیا ہے۔

کارِ مُلّا

اقبالؒ نے، جاوید نامہ میں، ترکی کے مشہور مدبّر، سعید حلیم پاشا (مرحوم) کی زبانی عجمی اسلام کے ان علمبرداروں کا جو نقشہ کھینچا ہے، میرے نزدیک اس سے

---

[1] مروجہ اسلام میں اس کے معنی یہ لے لئے گئے کہ قرآن مجید کو نہا دھو کر باوضو چھونا چاہئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جسم کی پاکیزگی بھی اچھی چیز ہے لیکن یہاں بات تطہیرِ قلب و دماغ کی ہو رہی ہے جس کے بغیر قرآنی مفاہیم سامنے نہیں آسکتے۔ اسی کو توحید کہتے ہیں۔

بہتر تصویر کشی اور حقیقت نگاری شاید ہی کہیں اور مل سکے ——— غور سے سُنئے کہ وہ کیا کہتے ہیں ——— کہتے ہیں :—

دینِ حق از کافری رسوا تر است　　　زانکہ مُلّا مومن کافر گر است

اللہ کا دین مُلّا کے ہاتھوں، کفر سے بھی زیادہ ذلیل و رسوا ہو گیا ہے۔ کیونکہ اس کا کام یہ رہ گیا ہے کہ (بجائے اس کے کہ وہ کافروں کو مسلمان کرے) اُلٹا مسلمانوں کو کافر بنا کر ملّت کی چھانٹی کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کا شیوہ ہی کافر گری ہے :—

شبنم ما در نگاہِ ما یم است　　　از نگاہِ او، یم ما شبنم است

ہماری نگاہوں میں اُمّت کا ہر فرد متاعِ گراں بہا ہے کہ :—

ہر فرد ہے ملّت کے مقدّر کا ستارہ

لیکن ان کے نزدیک اپنے فرقے کے سوا سب مسلمان جہنّم کا ایندھن ہیں۔ ان کی قیمت پرِ کاہ جتنی بھی نہیں۔

از شکر خندہائے آں قرآں فروش　　　دیدہ ام روح الامیں را در خروش

یہ قرآں فروش جس نے مذہب کو اپنا پیشہ بنا رکھا ہے، ایسی عجیب و غریب حرکتیں کرتا ہے کہ ان سے جبریلِ امینؑ تک بھی تلملا اٹھتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اِن لوگوں کی دین فروشی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ ایک مستقل موضوع ہے اور تفصیل کا متقاضی جس کے لئے سرِدست نہ فرصت ہے نہ گنجائش۔ اختصاراً یہ ایک شعر ہی کافی ہوگا کہ :—

یہی شیخِ حرم ہے جو چُرا کر بیچ کھاتا ہے　　　گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ

بات جاوید نامہ کی نظم کی ہو رہی تھی۔ اس کا اگلا شعر ہے :—

ز افسونِ گردوں دلش بیگانۂ　　　نزدِ او امّ الکتاب افسانۂ

حقائقِ قرآنی کے سرچشمہ، یعنی علمِ خداوندی سے وہ شناسا تک نہیں۔ اس کے نزدیک خدا کی کتاب، قصے، کہانیوں ـ اساطیر الاوّلین ـ کے سوا کچھ نہیں۔ (معاذ اللہ) افسانوں کا مجموعہ!

بے نصیب از حکمتِ دینِ نبیؐ　　　آسمانش تیرہ از بے کوکبی

وہ اس دین سے جسے حضور نبی اکرمؐ نے دُنیا کے سامنے پیش کیا تھا، قطعاً بے خبر ہے۔ جس آسمان کے نیچے وہ زندگی بسر کرتا ہے اس میں ایک چمکتا ہوا ستارہ بھی نہیں۔ اس لئے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا رہتا ہے :—

کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد　　　ملّت از قال و اقولش فرد فرد

وہ بے حد تنگ نظر ہے۔ کور ذوق ہے اور اس کے ساتھ بیہودہ گو بھی۔ اس کی بحث و جدل سے اُمّت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے۔ ملّت فرقوں میں بٹ چکی ہے :—

مکتب و مُلّا و اسرارِ کتاب کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب

صدیوں کی کورانہ تقلید اور علم و عقل سے نفرت و عداوت کی وجہ سے اس کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں سلب ہو چکی ہیں۔ اس لئے خدا کی کتاب کے رموز و حقائق کا سمجھ سکنا اس کے بس کی بات نہیں۔ ایسے ہی جس طرح کسی پیدائشی اندھے کو لاکھ سمجھاؤ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ سکتا کہ روشنی کسے کہتے ہیں؟

اقبالؒ کی حق گوئی اور تیغ نوائی کا مقطع یہ ہے — اور حقیقت یہ ہے کہ یہ اس موضوع پہ حرفِ آخر کا حکم رکھتا ہے کہ:—

دینِ کافر، فکر و تدبیرِ جہاد[له] دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

فی سبیل اللہ فساد

کفار کا کیش و مسلک تو یہ ہے کہ جہد للبقاء اور تسخیرِ کائنات کے لئے کیا کیا تدبیریں سوچی اور اختیار کی جائیں اور ان حضرات کا مذہب و مشرب یہ کہ خدا کے نام پر کس طرح فسادات کھڑے کئے جائیں۔

یوں تو اقبالؒ کا سارا کلام ہی بلند ترین حقائق اور حسین ترین شعریت کا مرقع ہے لیکن بعض مقامات پر اس کی رعنائی، گوہرِ تابناک کی طرح جگمگا اٹھتی ہے۔ مُلّا کے برپا کردہ فساد کو "فی سبیل اللہ فساد" کہنا اقبالؒ ہی کا حصہ ہو سکتا تھا۔

اس "فی سبیل اللہ فساد" کو انہوں نے دوسرے مقام پر ذرا شوخ انداز میں بیان کیا ہے۔ جب کہا ہے کہ قیامت میں:—

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا حق سے جب حضرتِ مُلّا کو ملا حکمِ بہشت!
عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت!
نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقول! بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت!
ہے بد آموزیِ اقوام و ملل کام اس کا اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت!

فساد کا اوّلین جرثومہ نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور ان حضرات کے مذہب و مسلک کی بنیاد ہی نفرت پر ہوتی ہے۔ اس سے بڑھ کر نفرت اور کیا ہوگی کہ یہ اپنے فرقہ کے سوا، تمام (غیر مسلم تو ایک طرف خود) مسلمانوں کو جہنمی قرار دیتے ہیں۔ یہ نفرت فریقِ مقابل کی زندگی تک ہی محدود نہیں ہوتی۔ اس کے مرنے کے بعد بھی بدستور (بلکہ پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ) باقی رہتی اور نمودار ہوتی ہے۔ ترکی کے مُلّا، اتاترک اور اس کی پارٹی کے خلاف تھے۔ یہ ۱۹۲۱-۲۳ء کی بات ہے۔ اس کے چالیس پینتالیس سال بعد:—

اتاترک کے ایک ساتھی، عمران اوکتم کی میت نمازِ جنازہ کے لئے جامع مسجد میں لائی گئی

له جہد و جہد سے مراد ہے۔

تو خطیب نے لاؤڈ سپیکر پر اعلان کرنا شروع کر دیا کہ وہ اس مرتد کی نماز جنازہ نہیں پڑھائیں گے اور نہ ہی کوئی دوسرا مسلمان نماز پڑھ سکتا ہے۔ اس پر اتاترک کے ایک اور ساتھی، جنرل عصمت انونو آگے بڑھے اور انہوں نے اعلان کیا کہ جب تک عمران اوکتم کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جاتی وہ گھر واپس نہیں جائیں گے۔ ان کے اس اعلان پر بہت سے لوگ جن کی ڈاڑھیاں تھیں ان کی طرف بڑھے۔ جب صورت حال نازک ہو گئی تو ترکی کی فوج کے جنرل تبی اپرتم نے پستول نکال لیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر کسی شخص نے ۸۰ سالہ جنرل انونو کو ہاتھ لگایا تو وہ گولی چلانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس طرح جنرل انونو کو ہجوم سے بچا لیا گیا۔ (بحوالہ مشرق ۶ مئی ۱۹۶۹ء)

عمران اوکتم (جن کے جنازہ کے ساتھ یہ کچھ کیا گیا) ترکی کی سپریم کورٹ کے صدر تھے اور ان کا جرم یہ تھا کہ وہ اتاترک اور عصمت انونو کے ساتھیوں میں سے تھے۔ اتاترک اور عصمت انونو کے ساتھ ہزار اختلافات کے باوجود ایک دنیا جانتی ہے کہ اگر ۱۹۲۲ء میں یہ جانباز اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھ کر آگے نہ بڑھتے تو یہ خطیب صاحب اور ان کی مسجد اہلِ صلیب کے تسلط میں ہوتی۔ لیکن مولوی صاحبان کو اس سے کیا غرض؟ ان کا کام تو مسلمانوں کو کافر اور مرتد قرار دینا۔ ان کی زندگی میں ان کی بیویوں پر طلاق وارد کرنا، اور مرنے کے بعد ان کی نمازِ جنازہ کو ناجائز قرار دینا ہے۔ اس کے مظاہرے آپ آئے دن یہاں بھی دیکھتے رہتے ہیں۔

(۲)

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، ملوکیت، مذہبی پیشوائیت کی پرورش اور حوصلہ افزائی کرتی ہی اسی لئے ہے کہ یہ اس کی اپنی بقا اور استحکام کا ذریعہ بنتی ہے۔ بزورِ شمشیر حاصل کرنے والے مستبد حکمران کو ظل اللہ علی الارض کی حیثیت سے منوانا مذہبی پیشوائیت ہی کی کرشمہ سازی کا نتیجہ ہو سکتا تھا۔ اربابِ اقتدار لاکھ زور لگاتے ازخود ایسا بن سکتے تھے نہ منوا سکتے۔ اتنا ہی نہیں۔ اربابِ اقتدار جو کچھ کرنا چاہتے اس کے جواز اور عین مطابقِ اسلام ہونے کا فتویٰ ان حضرات سے حاصل کر لیتے تھے۔ اس طرح ان حکمرانوں کی رعایا ان کے ظلم و استبداد اور سلب و نہب کو بطیبِ خاطر برداشت کر لیتی تھی کہ دین کے یہ مدعی اسے منشائے خداوندی کہہ کر عوام کو مطمئن کرا دیتے تھے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

ان کی اس قسم کی دین فروشی اور دیدہ دلیری کو دیکھ کر اقبالؒ کا دلِ دردمند پکار اٹھتا تھا کہ

سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہِ سوزناک مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوبِ سلطان و امیر

یہ سیاست سلوکیت کی انتہائی چابکدستی تھی کہ اس نے امورِ مملکت تو خود اپنے ہاتھ میں رکھے، اور نکاح، طلاق وغیرہ مسائلِ مذہبی پیشوائیت کے سپرد کرکے انہیں مطمئن کر دیا کہ حکومت کا ایک شعبہ ان کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ امورِ سیاست سے یہ حضرات یکسر بے بہرہ رہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران جس طرح یہ لوگ ہندو عیار کے ہاتھوں میں کھلونے بن کر کھیلتے رہے، اسے دیکھ کر اقبالؒ نے کہا تھا کہ:

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے؟
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام!

(غیر منقسم) ہندوستان میں، جب تحریکِ خلافت کے زمانے میں علماء حضرات کو پہلی بار سیاست میں لایا گیا، تو ان کی اس میدان میں تہی مائگی اور ناتجربہ کاری کی بنا پر اقبالؒ نے اس کی مخالفت کی تھی۔ انہوں نے اکبر شاہ خان صاحب (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ:

آپ نے ٹھیک فرمایا ہے کہ پیشہ ور مولویوں کا اثر سرسید احمد خانؒ کی تحریک سے بہت کم ہو گیا تھا مگر خلافت کمیٹی نے اپنے پولیٹیکل فتووں کی خاطر ان کا اقتدار پھر ہندی مسلمانوں میں قائم کر دیا ہے۔ یہ بہت بڑی غلطی تھی جس کا احساس ابھی تک غالباً کسی کو نہیں ہوا۔

پھر انہوں نے ۱۹۳۲ء میں اپنے ایک بیان میں، جو روزنامہ انقلاب (لاہور) کی ۲۳ اپریل کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، قوم کو مخاطب کرکے فرمایا تھا کہ:

تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند فطری، ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی، بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔

علامہ اقبالؒ نے جو کہا تھا کہ ان علماء کو میدانِ سیاست میں لانے کی جو غلطی قوم نے کی ہے اس کا احساس اس زمانے تک کسی کو نہیں ہوا تھا، سو اس کا احساس تحریکِ پاکستان کے زمانے میں ہوا۔ ہندوؤں نے انہیں اپنا آلہ کار بنایا اور قوم کی بیشتر توانائیاں وقت اور پیسہ ان کی مخالفت کی مدافعت میں ضائع ہو گیا۔ یہ کہتے تھے کہ جب ہندو ہمیں مذہبی آزادی کی ضمانت دیتا ہے تو مسلمانوں کے لئے الگ مملکت کی ضرورت کیا ہے؟ یہ وہی مذہبی آزادی تھی

جو انہیں اپنے دورِ ملوکیت میں حاصل تھی۔ یہ اسی کو اسلام کی آزادی سمجھتے تھے۔ اسی بنا پر علامہؒ نے کہا تھا کہ:-

ملا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت — ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنیؒ ان علماء کے سرخیل کہے جاتے تھے۔ وہ حقیقی اسلام کے مبادیات تک سے کس قدر ناآشنا تھے اس کا اندازہ اس بحث سے بخوبی لگ سکتا ہے جو مسلم قومیت کے مسئلہ پر ان کے اور علامہ اقبالؒ کے مابین ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ان کے نصابِ تعلیم سے علومِ سیاست اور قرآن دونوں خارج تھے۔ یہ جبہ و قبہ میں ملبوس حضرات، اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کے متعلق بار بار کہا کرتے تھے کہ یہ مغرب زدہ انگریز پرست۔ اسلام ناآشنا۔ مسٹر قسم کے لوگ ملحد و بےدین ہیں۔ یہ کیا جانیں اسلام کسے کہتے ہیں؟ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہؒ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ:-

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی — اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی!

اس وقت ہمارے ہاں تدوینِ قانون سازی میں جو دھول اڑ رہی ہے، اس کے ذمہ دار بھی انہی حضرات کے باہمی اختلافات ہیں۔ انہوں نے ۱۹۵۱ء میں بڑے طمطراق سے اعلان کیا کہ ہم نے اپنے اختلافات مٹا لئے ہیں اور قوانین سازی کی متفق علیہ بنیاد فراہم کر لی ہے۔ وہ بنیاد کیا تھی؟ یہ کہ ملک کے قوانین کتاب و سنت کے مطابق ہوں گے۔

اختلافات

اس باہمی اتفاق کی حقیقت کیا تھی اس کے متعلق اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ (کتاب کا لفظ تو محض برائے وزنِ بیت تھا۔ جہاں تک سنت کا تعلق ہے) سنت کا کوئی متفق علیہ مجموعہ تو ایک طرف، سنت کہتے کسے ہیں، اس پر بھی سب کا اتفاق نہیں۔ ان کے سب فرقوں کی سنت الگ الگ ہے؛ اسی پر تو ان کے فرقوں کی بنیاد ہے۔ اس حقیقت کی روشنی میں سوچئے کہ کیا اس بنیاد پر ملک کا کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب ہو سکتا ہے جسے یہ سب اسلامی تسلیم کر لیں؟ ہم حیران تھے کہ ایسی کھلی ہوئی حقیقت بھی ہمارے واضعینِ قوانین کو نظر نہیں آئی؛ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ دھند چھٹ رہی ہے اور روشنی کی کرن ان حضرات کو دکھائی دینے لگی ہے۔ اگلے دنوں مجلسِ شوریٰ کے صدر، محترم خواجہ صفدر صاحب نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا کہ:-

> ملک میں مکمل اسلامی نظام کی راہ میں فقہ کا اختلاف ایک رکاوٹ ہے۔ ان اختلافات کو ختم کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ ان اختلافات کو ختم کئے بغیر ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ حماقت ہوگی۔ ۔ ۔ ۔ انہوں نے ایک بار پھر کہا کہ مختلف مکاتبِ فکر کا باہمی فقہی اختلاف تاخیر کا باعث بن رہا ہے۔ اور ہمیں زیادہ سوچ بچار کے بعد ایسا متفقہ لائحہ عمل تیار کرنا ہے جو انتشار کی راہیں بند کر دے۔ (جنگ۔ لاہور۔ ۲۷ مارچ ۱۹۸۳ء)

ان (مزعومہ) کوششوں کے بارے میں جو اختلافات مٹانے کے سلسلہ میں کی جا رہی ہیں۔ خواجہ

صاحب نے دوسرے موقعہ پر فرمایا :-

ان فقہی اختلافات پر علمائے کرام غور کر رہے ہیں۔ ان کا حل نکالا جائیگا۔ یہ اختلافات طے کئے بغیر فوری طور پر اسلامی قوانین کا نفاذ انتشار کا باعث بنے گا۔
(جنگ۔ لاہور۔ ۲۲ مارچ ۱۹۸۳ء)

ہم نہیں سمجھتے کہ محترم خواجہ صاحب جیسا پختہ کار، صاحب دانش و بینش سیاست دان اتنی سی بات بھی نہ جانتا ہو کہ جو علماء ہزار برس میں اتنا سا باہمی اختلاف بھی نہ مٹا سکے ہوں کہ نماز میں آمین اونچی آواز سے کہنی چاہئے یا نیچی آواز سے، اور تراویح آٹھ پڑھنی چاہئیں یا بیس، وہ ان فقہی اختلافات کو مٹا سکیں گے جو ملکی قوانین کی تدوین کی راہ میں حائل ہیں؟ ہم سے تو غالب زیادہ معاملہ فہم تھا جو جلد ہی اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ :-

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟

ان میں یہ اختلافات آج سے پیدا شدہ نہیں۔ (اقبالؒ کے الفاظ میں) "دیرینہ ہے تیرا مرض کور نگاہی"۔ یہ، روایات اور فقہ کے اولین دور ہی میں پیدا ہو چکے تھے۔ اس کی ایک مثال علامہ محمد اسلم جیراجپوریؒ نے اپنی کتاب "ہمارے دینی علوم" میں ان الفاظ میں پیش کی ہے :-

روایات کا یہ اختلاف دیار و امصار، یعنی حجاز و عراق وغیرہ پر محدود نہیں تھا بلکہ ایک ہی مقام میں مختلف اور متضاد روایتیں ہوتی تھیں۔ اس کا ایک نمونہ عبد الوارث بن سعید کا بیان ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "میں مکہ میں آیا تو معلوم ہوا کہ یہاں عراق کے نامور فقہا، حج کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ پہلے میں امام ابو حنیفہؒ کے پاس پہنچا اور ان سے پوچھا کہ بیع میں بائع اگر کوئی شرط لگائے تو کیا وہ جائز ہوگی؟ جواب دیا کہ بیع بھی باطل ہے اور شرط بھی۔ پھر میں نے ابن ابی لیلیٰ سے بھی جا کر یہی سوال کیا، انہوں نے کہا کہ بیع جائز ہے اور شرط باطل ہے۔ اس کے بعد ابن شبرمہ سے جا کر دریافت کیا۔ بولے بیع بھی جائز ہے اور شرط بھی جائز ہے۔

میں نے دل میں کہا کہ سبحان اللہ! یہ تینوں فقہا ایک ہی جگہ کے ہیں اور ان میں ایک ہی مسئلہ میں رایوں کا اس قدر اختلاف!

اب دوبارہ میں ابو حنیفہؒ کے پاس گیا اور ان سے یہ سب باتیں کہیں، فرمایا معلوم نہیں کہ وہ لوگ کیوں ایسا کہتے ہیں۔ مجھے تو حدیث ملی ہے :-

حدثنی عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع و شرط۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کے ساتھ شرط ممنوع فرمائی۔

یہ سن کر میں ابن ابی لیلیٰ کے یہاں پہنچا اور ان سے بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ حدثنی

هشام عن عروۃ عن ابیہ عن عائشۃؓ قالت امرنی رسول اللہ ان اشتری بریرۃ فاعتقہا فاشترط اہلہا الولاء لانفسہم فقال رسول اللہؐ ما کان من شرط لیس فی کتاب اللہ فہو باطل۔ یعنی حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ میں بریرہ کو خرید کر آزاد کر دوں۔ اس کے مالکوں نے شرط یہ کی کہ ولا ان کی رہے گی۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جو شرط کتاب اللہ میں نہیں وہ باطل ہے۔

اب ابن شبرمہ کے پاس آیا، انہوں نے سب کچھ سن لینے کے بعد کہا کہ حدثنی مسعر بن کدام عن محارب بن دثار عن جابر قال بعت النبی بعیرا وشرطت لی حملانہ الی المدینۃ۔ یعنی میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ ایک اونٹ بیچا اور میری یہ شرط منظور کی گئی کہ اس پر لد کر مدینہ تک جاؤں گا۔

اس پر، علامہ موصوف نے اپنے مخصوص انداز میں، چار سطروں میں جو تبصرہ فرمایا ہے، وہ اپنے مقام پر منفرد ہے۔ فرماتے ہیں :-

مگر اس کا الزام صرف روایات کے اختلاف پر نہیں بلکہ مذہبی انفرادیت پر بھی ہے۔ اگر اجتماعی مرکز، فقہ کو اپنے ہاتھ میں رکھتا تو ساری ملّت کی ایک ہی فقہ ہوتی اور شخصی فقہوں میں پڑ کر وہ فرقوں میں تقسیم نہ ہو جاتی۔ اور اس مرکزیت کی وجہ سے حدیثوں کی بھی یہ حالت نہ ہوتی۔

روایات اور فقہ کے یہ اختلاف اسی ایک مسئلہ میں نہیں۔ زندگی کے ہر گوشے اور ہر معاملہ میں یہی کیفیت ہے۔ اور مشکل یہ ہے کہ کوئی فرقہ اپنے معتقدات یا مسائل میں ذرا سی تبدیلی کے لئے بھی تیار نہیں۔ ان حالات میں آپ سوچئے کہ کیا یہ کسی طرح بھی ممکن ہے کہ یہ حضرات کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کر سکیں یا کسی ایسے ضابطہ پر متفق ہو سکیں جس میں ان کے اختلافات کی گنجائش نہ ہو۔ ایسا سمجھنا خوش فہمی ہی نہیں خود فریبی ہے۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ان کا تشخص ان اختلافات کی غیر متبدل حدود سے متعین ہوتا اور قائم رہتا ہے۔ یہ اختلافات مٹ جائیں تو ان کی جداگانہ ہستی ہی ختم ہو جائے۔ توحید کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ اختلافات کے بت باقی نہیں رہتے۔ غالب نے کس قدر عمیق اور بلیغ انداز میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ :-

ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

یہ حضرات بڑے دعوے سے کہا کرتے ہیں کہ اس بات کا ثبوت کہ ہمارے اختلافات مٹ سکتے ہیں۔ تحریک نظام مصطفیٰ کا متحدہ محاذ ہے جس میں مختلف فرقوں کے علماء اپنے اختلافات مٹاتے ہوئے شانہ بشانہ جادہ پیما تھے۔ ان حضرات کے اختلافات کس حد تک مٹ چکے تھے، اس کا اندازہ دو ایک واقعات سے لگائیے۔ مفتی محمود (مرحوم) نے حیدر آباد پریس کلب میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مودودی صاحب (مرحوم) کے متعلق فرمایا تھا:۔

مودودی نے جمعیت العلماء کے مولویوں کے خلاف فتویٰ دیا ہے۔ مودودی کو فتویٰ دینے کا حق حاصل نہیں۔ فتویٰ دینے کا حق مجھے ہے۔ میں اب تک پندرہ ہزار فتوے دے چکا ہوں۔ اور وہ سب مجلد کتابوں میں موجود ہیں۔ میں آج اس پریس کلب میں فتویٰ دیتا ہوں کہ مودودی، گمراہ، کافر، اور خارج از اسلام ہے۔ اس لئے، اور اس کی جماعت سے تعلق رکھنے والے کسی مولوی کے پیچھے نماز پڑھنا، ناجائز اور حرام ہے۔ اس کی جماعت سے تعلق رکھنا کفر اور ضلالت ہے:۔

وہ امریکہ اور سرمایہ داروں کا ایجنٹ ہے۔
اب وہ موت کے آخری کنارے پر پہنچ چکا ہے اور اب اسے کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ اس کا جنازہ نکل کر رہے گا۔

(ہفت روزہ زندگی۔ لاہور۔ مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۶۹ء)

متحدہ محاذ میں شمولیت کے باوجود، نہ مفتی صاحب نے اپنے اس فتویٰ کو واپس لیا تھا اور نہ ہی مودودی صاحب نے اس کے خلاف احتجاج کیا تھا۔

جمعیت العلماء اسلام اور جمعیت العلماء پاکستان، دونوں اہل سنت والجماعت کے حنفی فرقہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ دونوں متحدہ محاذ میں شامل تھیں لیکن اس کے باوجود باہمی اختلافات کی کیفیت یہ تھی کہ:۔

۲۵ر اگست ۱۹۷۷ء کی شام، پاکستان متحدہ محاذ کے بڑے بڑے لیڈر جب افطاری کرنے لگے، تو اسلامی اخوت اور نظام مصطفیٰ کے قیام کے دعوے داروں کے درمیان ایک عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔ یہ لیڈر جب افطاری کر چکے تو نماز کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور لوگ وہاں یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ مفتی صاحب اور نواب زادہ نصراللہ خاں دس بارہ آدمیوں کو لے کر ایک طرف چل پڑے، اور ان نمازیوں کی امامت مفتی صاحب نے کی۔ جب کہ مولانا نورانی اور میاں طفیل محمد دوسری طرف کھڑے ہو گئے۔ یہاں شاہ احمد نورانی نے

جماعت کراچی اور تحریک استقلال کے میاں محمود علی قصوری نے بھی نورانی صاحب کے پیچھے نماز پڑھی۔

(مساوات ۲۷ اگست ۱۹۷۷ء)

اس سے واضح تر، مولانا نورانی کی وہ تقریر ہے جو معاصر ایشیاء کی (۱۵۔ جنوری ۱۹۸۱ء) کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انہوں نے فرمایا تھا :-

ابھی حال ہی کا ذکر ہے کہ میں اور مولانا عبدالستار نیازی، مولانا غلام علی اوکاڑوی اور مولانا سید حسین الدین شاہ صاحب، یہ ابھی تین چار روز پہلے (۱۳، اکتوبر ۱۹۸۰ء جمعرات) کا ذکر ہے کہ ہم سب جنرل ضیاء الحق سے ملاقات کے لیے گئے تاکہ دارالعلوم اور ایک مسجد کا سنگِ بنیاد ان سے رکھوایا جائے، تو جب ان سے باتیں ہو رہی تھیں، انہوں نے یہ فرمایا میں نے سُنا ہے کہ آپ بڑے وسیع القلب ہیں، آپ میں بڑی رواداری ہے، آپ میں بڑی فراخ دلی ہے اور پھر فرمانے لگے کہ اسی فراخ دلی کا نتیجہ ہے کہ جب آپ سہالہ میں تھے۔ آپ نے ان لمحات میں رواداری اور وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فلاں صاحب کے پیچھے نماز پڑھی۔ مجھے یہ رپورٹ ملی ہے۔ میں سنتا رہا۔ جب ان کی بات ختم ہو گئی تو میں نے جواباً عرض کیا۔ جنرل صاحب بڑا افسوس ہے، آپ کو غلط اطلاعات دی گئیں۔ ہم میں الحمدللہ بڑی وسعتِ قلبی ہے لیکن گستاخِ رسولؐ کے لئے کوئی وسعت نہیں۔ ہم میں رواداری ہے لیکن حضور پُرنورؐ کی شان میں تنقیص کرنے والے کے لیے کوئی رواداری نہیں۔ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت امامِ اہلِ سنت مولانا احمد رضا خان فاضل بریلویؒ کا لکھا ہوا مجموعہ فتاویٰ حسام الحرمین کے نام سے مشہور ہے جس میں علماء حرمین شریفین کے فتویٰ موجود ہیں اور مسلک اعلیٰ حضرت کی تصدیق ہے۔ ہم الحمدللہ! اس فتوے پہ عمل کرتے ہوئے کوئی بھی شخص ہو خواہ ڈیرہ اسماعیل خاں کا ہو، ملتان کا ہو، اچھرہ کا ہو، کسی شاتمِ رسولؐ کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ اور میں نے کہا۔ جناب والا! یہ چار چار ٹکے کے لوگ ہیں۔ ہم تو حرمین شریفین کے نجدی امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ یہ مُلّا جو چار چار ٹکے کے ہیں ان کے پیچھے نماز پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ کو یہ غلط اطلاع ملی ہے، آپ مطمئن رہیں، ہمارے مسلک میں ایسی رواداری، فراخ دلی اور وسعتِ قلبی نہیں ہے۔ ہمارے قلب میں شاتمِ رسولؐ کے لئے کوئی وسعت نہ آج ہے

دائندہ ہوگی۔ اور اس کے لیے لوگ بہت سی باتیں کہتے ہوں گے۔
قومی اسمبلی میں بھی اذان ہوتی تھی، علامہ ازہری موجود ہیں۔ ان
لوگوں کا رُخ ایک طرف ہوتا تھا اور ہمارا رُخ ان سے دوسری طرف۔
اس کے دیکھنے والے ایک نہیں، دو نہیں بے شمار لوگ ہیں۔
(بحوالہ طلوعِ اسلام۔ بابت فروری ۱۹۷۵ء صفحہ ۶۲)

یہ تھی نظامِ مصطفیٰ کے لئے جہاد میں ان کی صفوں میں اتحاد کی عملی شکل! وہ اتحاد کسی مذہبی مقصد کے لئے تھا ہی نہیں۔ سیاسی مفاد کے لئے تھا۔ مقصد مذہبی ہوتا تو اتحاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ جوں ہی وہ مقصد ختم ہوا، وہ اتحاد بھی کالعدم ہو گیا۔

(۶)

ملوکیت کا مفاد اسی میں ہوتا ہے کہ یہ حضرات ایسے بے کار مسائل کے متعلق بحثوں میں الجھے رہیں جن کا زندگی کے عملی معاملات سے کوئی تعلق نہ ہو، اور قوم تشتت و انتشار کا شکار رہے۔ مثلاً :-

ابنِ مریمؑ مر گیا یا زندۂ جاوید ہے! | ہیں صفاتِ ذاتِ حق حق سے جدا یا عینِ ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے | یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریمؑ کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم | اُمّتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات
(ابلیس کی مجلسِ شوریٰ)

غرضیکہ :-

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے | تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

جس اسلام کی قوم کو تلقین کی جاتی ہے اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے اپنی اسی نظم میں جس کے چند اشعار پیش خدمت کئے گئے ہیں، ابلیس کے ایک مشیر کی زبان سے کہلوایا ہے کہ :-

ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود | ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام
آرزو اول تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں | ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام
یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج | صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

اور آخر میں یہ کہ :-

ہے طوافِ و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کُند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام

اس کی تیغ بے نیام کے کُند ہو کر رہ جانے کی اس سے بڑی اور زندہ بشارت اور کیا ہو

سکتی ہے کہ ابھی کل کی بات ہے فلسطین اور لبنان کی سرزمین بے گناہ مردوں، مظلوم عورتوں اور معصوم بچوں کے خون سے لالہ زار بنتی رہی اور اب تک بن رہی ہے۔ لیکن مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک دیکھئے تو ان اُٹاون ملکتوں کے مسلمانوں کی تلواریں سب کی سب کُند ہو کر رہ گئی ہیں۔ ایک بھی فضا میں نہیں اُبھری۔ اور اس تمام دوران میں ہر سال لاکھوں کی تعداد میں مسلمان حج کا مقدس فریضہ ادا کرنے کے لئے جمع ہوتے، اور عرفات کے میدان میں دشمنانِ اسلام کی ذلت و خواری کی دعائیں مانگ کر اپنے اپنے ممالک کی طرف واپس آتے رہے ہیں۔ اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ آسام کے مسلمان یا بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہو رہے ہیں یا ڈھور ڈنگر کی طرح اپنے گھروں سے باہر ہانکے جا رہے ہیں۔ خونِ مسلم کی اس بے پناہ ارزانی کے خلاف کہیں سے آواز تک نہیں اُٹھتی۔ البتہ ایک ایک مسجد کے چار چار لاؤڈ سپیکروں سے ذکر و فکر کی محفلیں گرم کر کے جنت میں محلات تعمیر کرانے کے اعلانات مسلسل و پیہم فضا میں گونجتے رہتے ہیں۔ یہ سب اُس اسلام کی برکات ہیں جس کے بیج ہمارے دورِ ملوکیت میں بوئے گئے اور جسے آج استعماری قوتوں کی نوازش ہائے گراں مایہ سے پروان چڑھایا جا رہا ہے۔ اقبالؒ بہت پہلے اس گُر کو سمجھا گیا تھا کہ:

پسر را گفت پیرے خرقہ بازے — ترا ایں نکتہ باید حرزِ جاں کرد

بہ نمرودانِ ایں دور آشنا باش — ز فیضِ شاں براہیمیؑ تواں کرد (ارمغانِ حجاز)

ایک بڈھے اور جبّہ پوش نے اپنے بیٹے سے کہا کہ میں تمہیں ایک گُر بتاتا ہوں جسے اچھی طرح گرہ میں باندھ لو۔ وہ گُر یہ ہے کہ اس دور کے نمرودوں کے ساتھ یارانہ رکھو، اور ان کے فیوض و اکرام سے "اسلام کا جھنڈا" بلند کرتے رہو۔

اس دور کے نمرودوں نے اس مقصد کے لئے سب سے پہلا داؤ اس وقت پھینکا جب انہیں کمیونزم کی یلغار کو روکنے کے لئے، مسلم ممالک کی تائید اور حمایت کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اس کے لئے انہوں نے انہیں سیاسی دعوت نہیں دی۔ ان کی دکھتی ہوئی رگ کو پکڑا۔ انہوں نے آواز دی کہ:-

"دنیا کے خدا پرستو! آؤ! اس الحاد اور بے دینی کے خلاف متحدہ محاذ بنائیں۔"

قرآن کی رُو سے جس طرح روس خدا کا منکر ہے اسی طرح مغرب کی عیسائی اقوام بھی اس کی منکر ہیں۔ وہ ان دونوں میں فرق نہیں کرتا اور دونوں کو اس خدا پر ایمان لانے کے لئے کہتا ہے جس کا تصور قرآن پیش کرتا ہے۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے اس دعوت پر گھی کے چراغ جلاتے اور اس پر لبیک کہتے ہوئے ان کی طرف دوستی (کیا؟ زیر دستی) کا ہاتھ بڑھایا اور کہا کہ اگر سرمایہ دار اقوامِ مغرب کا یہ بلاک فی الواقعہ مسلمانوں کی حمایت چاہتا ہے تو انہیں یہ دعوت ان کی مذہبی پیشوائیت کو دینی چاہئے۔ چنانچہ سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے پبلک جلسوں میں تقریر

ہوئے کہا :۔

اگر یہ بلاک فی الواقعہ یہ چاہتا ہے کہ کمیونزم کی روک تھام کے لئے اسے مسلم عوام کا دلی تعاون حاصل ہو تو اسے اپنی بنیادی پالیسی میں بنیادی تغیر کرنا پڑے گا۔ اسے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اسے مسلم بلاک کے حکمرانوں سے ساز باز کرنا ہے یا مسلم ممالک کے عوام کا تعاون حاصل کرنا ہے۔ یہ اس کے سوچنے کا کام ہے کہ اسے کون سی راہ اختیار کرنی چاہئے۔ اسے حکمرانوں کی ضرورت ہے جو عوام پر سطحی اثر بھی نہیں رکھتے یا عوام کے تعاون کی ضرورت ہے جو طاقت کا اصلی سرچشمہ ہوتے ہیں ۔۔۔ مسلمان ملکوں کے ساتھ آپ کی جو پالیسی اب تک چل آ رہی ہے وہ ایسی ہرگز نہیں ہے کہ پاکستان اور دوسرے ممالک کے عوام کا دلی تعاون آپ کو حاصل ہو سکے۔

(اخبار تسنیم۔ مورخہ (۱۰) تا (۲۰) دسمبر ۱۹۵۵ء)

بلکل واضح تھی۔ مسلم ممالک کے عوام مذہب پرست واقعہ ہوئے ہیں اس لئے اس بلاک سے جو کہا جا رہا تھا وہ یہ تھا کہ تم ان ممالک کے حکمرانوں کے بجائے وہاں کی مذہبی پیشوائیت سے بات کرو۔ وہاں کے عوام کا تعاون بھی تمہیں حاصل ہو جائے گا اور حکمرانوں کا بھی، کیونکہ جب وہ کہیں گے کہ اس بلاک کی حمایت اسلام کا تقاضا ہے تو ان (حکمرانوں) کو جرأت نہیں ہوگی کہ وہ اس کے خلاف جا سکیں۔ اس بلاک اور ہماری مذہبی پیشوائیت میں اس باب میں کس قسم کی سودا بازی ہوئی اس سے پہلے تو یہ راز ہی تھا لیکن اب اس تحریک کی شکل میں بے نقاب ہو گئی ہے جسے فنڈا مینٹل ازم کہا جاتا ہے۔ اس کے مراکز مغربی ممالک میں ہیں اور شاخیں مسلم ممالک میں ان کی طرح) پھیلی ہوئی ہیں۔ زر و سیم کے چشمے وہاں سے ابلتے ہیں اور ان کے صدقے ان کی منشار کا "اسلام" ساری دنیا میں پھیلایا جا رہا ہے —— اسلامک مشن، اسلامک سنٹرز، اسلامک کانفرنسیں، اسلامک سیمینار —— اور معلوم کیا کیا "اسلامک"؟ اور پھر اس مقدس جلیلہ کی خاطر اپنے مذہبی راہ نما جس طرح سال کا آدھا آدھا حصہ، ان ممالک کے اعلےٰ درجہ کے ہوٹلوں میں گذارتے ہیں وہ کس کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے؟ اس تناظر میں آپ کی سمجھ میں یہ بات آ جائے گی جسے اس دانش ور نے پچاس سال پہلے کہا تھا کہ :۔

بہ نمرودانِ ایں دَور آشنا باش ز فیضِ شان براہیمی، تو اں کرد

اس طرح وہ خطرہ ٹل گیا جو ہمارے دَور کی ملوکیت اور سرمایہ داری کو عفریت کی طرح ڈرا رہا تھا کہ

عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں!

ان سے کہہ دیجئے کہ آپ ان خرقہ بازوں سے ساز باز رکھئے اور چین کی نیند سوئیے۔ یہ شرعِ پیغمبر کو کبھی آشکارا نہیں ہونے دیں گے۔ کہ اس سے تمہارا ہی نہیں، خود ان کا مفاد بھی وابستہ ہے۔ والسلام

—— ؞ ——

قرآنی فیصلے

(جلد پنجم)

طلوعِ اسلام کی مسلسل کاوش اور کوشش کا نتیجہ تھا کہ افرادِ ملت نے اسلام کے متعلق غور و فکر سے کام لینا شروع
اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ان کے دل میں مختلف قسم کے شکوک پیدا ہوئے اور اعتراضات ابھرنے لگے۔ یہ شکوک وا
بیشتر اس اسلام کے پیدا کردہ تھے جو ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ یا اس تعلیم کے پیدا کر
ہمارے سکولوں اور کالجوں میں دی جاتی ہے۔ طلوعِ اسلام نے اپنا فریضہ سمجھا کہ وہ ان شکوک کا ازالہ کرے اور ان اعترا
کا جواب دے۔ چنانچہ طلوعِ اسلام کے پاس یہ سوالات آتے گئے اور یہ ان کے جوابات دیتا چلا گیا۔ سوال و جواب
یہ سلسلہ اس قدر اہم تھا کہ اربابِ فکر و نظر کے تقاضے کے پیشِ نظر اسے الگ کتابی شکل میں شائع کرنا ضروری سمجھا گیا۔
اس نہایت اہم اور مقبول سلسلہ کا نام ہے

قرآنی فیصلے

جس کی چار جلدیں پہلے شائع ہو چکی تھیں اور پانچویں جلد اب شائع ہوئی ہے۔ اس میں کثیر تعداد سوالات اور ان کے اطمینان
بخش جوابات آ گئے ہیں۔ تفصیل میں جانے کی تو گنجائش نہیں۔ اس کے ان ابواب پر ایک نگاہ ڈالئے۔

(۱) مذہبی پیشوائیت اور اسلام (۲) شرعی قوانین (۳) علماء کی باہمی پرچھتول (۴) تحریکِ پاکستان اور علماء حضرات (۵) اسلام
اور نظامِ مصطفیٰ (۶) زکوٰۃ کا مفہوم اور نظامِ زکوٰۃ میں تبدیلیاں (۷) ارکانِ اسلام کے متعلق (۸) جنسیات (۹) تحفظِ ناموسِ رسالت

ہر باب کے تحت بکثرت سوالات اور ان کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ ضخامت (پہلی چار جلدوں کے مقابلہ میں زیادہ
یعنی) ۵۱۲ صفحات۔ قیمت: -/۳۰ روپے۔
(سابقہ جلدوں کی قیمت: جلد اول -/۱۰ روپے۔ جلد دوم -/۱۰ روپے۔ جلد سوم -/۱۰ روپے۔ جلد چہارم -/۱۵ روپے۔ علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ

(۱) مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار لاہور ● (۲) ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲۔ لاہور

اس کتاب کے تازہ ایڈیشن کا برسوں سے انتظار تھا

اسلام کیا ہے

پرویز

ہمارا یہ دعویٰ ہے (اور یہی برایان دعویٰ ہے) کہ اسلام نوعِ انسان کی جملہ مشکلات کا حل پیش کرتا ہے لیکن جب یہ پوچھا جاتا ہے کہ اسلام ہے کیا تو مختلف گوشوں سے مختلف آوازیں اٹھتی ہیں جن کا ماحصل نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اور نکاح و طلاق کے مسائل سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اگر اسلام صرف یہی ہے تو اس سے زندگی کے مسائل کا حل تو نہیں مل سکتا۔ اسلام ایک نظامِ حیات ہے جس کی بنیاد چند غیر متبدل تصورات پر قائم ہے۔ جب تک یہ تصورات واضح طور پر سامنے نہ آئیں، اسلام بحیثیت ایک نظامِ حیات کے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ضرورت تھی کہ ان تصورات کو واضح، دل کش انداز اور عصرِ حاضر کے علوم کی روشنی میں یکجا پیش کیا جائے ——— یہ کتاب اس ضرورت کو پورا کر دیتی ہے۔ اگرچہ اس کی پہلے بھی بڑی ضرورت تھی لیکن اب جبکہ اسلام، اسلام کا چرچا عام ہو رہا ہے لیکن کوئی نہیں بتاتا کہ اسلام ہے کیا، اس کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ یہ کتاب (۱) ہمارے مذہب گزیدہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے مطالعہ میں آجائے تو انہیں علیٰ وجہ البصیرت اسلام کا گرویدہ بنا لے اور (۲) غیر مسلموں کے ہاتھوں میں دے دی جائے تو اسلام کے متعلق ان کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔

اس کا تازہ ایڈیشن بڑے سائز کے ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ عمدہ سفید کاغذ پر ادارہ طلوعِ اسلام کے روایتی معیار کے مطابق مضبوط، مزین اور مجلد شائع کی گئی ہے۔ قیمت ۴۵ روپے۔ ڈاک پیکنگ ۵ روپے

چونکہ اس کے لئے تقاضوں کی کثرت ہے اس لئے کتاب کی ترسیل فرمائشوں کی ترتیب کے مطابق ہوگی۔

ملنے کا پتہ

(۱) مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار لاہور

(۲) ادارہ طلوعِ اسلام، ۲۵/بی، گلبرگ نمبر ۲۔ لاہور

سرسیدؒ۔ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ

(مملکتِ پاکستان کے اقنومِ ثلاثہ)

۲۱ اپریل، مصورِ پاکستان علامہ اقبالؒ کا یومِ وفات ہے اس لئے اس تقریب کا شایانِ شان طریق سے منانا، ملتِ پاکستانیہ کی زندگی کی دلیل ہے۔ لیکن حضرتِ علامہؒ اس سلسلۂ زریں کی درمیانی کڑی تھے جس کا حاصل مملکتِ پاکستان تھا۔ اس سلسلہ کا آغاز مسلمانانِ ہند کا بطلِ جلیل، سرسیدؒ تھا اور آخری نقطہ قائدِ اعظمؒ۔ آج کی نشست میں ہم ان ہر سہ محسنینِ ملتِ اسلامیہ کی حیاتِ جاوید کے چند تابندہ نقوش، حسبِ سابق، پیشِ خدمت کرتے ہیں تاکہ اس زود فراموش قوم کے ذہن میں اپنے ماضی کی کچھ یاد تو تازہ رہے۔

انیسویں صدی (عیسوی) کا آغاز ہو چکا تھا۔ سلطنتِ مغلیہ کا جاہ و جلال آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس برصغیر کے مسلمانوں کی داستانِ زوال مایوسی اور شکست کے ان مراحل سے دوچار ہو رہی تھی جن کا انجام حسرت ناک موت کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ قومی زوال و شکست کی یہ تاریک رات عہدِ رفتہ کی سمت میں صدیوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ سلطانی اور ملوکیت "ظل اللہ" کا لبادہ اوڑھ کر، اور اسلام کی محافظ بن کر آئی تھی۔ دینِ خدا کو دینِ استبداد میں اسی نے تبدیل کیا تھا۔ اُس کی عطا فرمودہ آزادیٔ فکر و نظر پر خوف و ہراس کی تعزیریں اسی نے مسلط کی تھیں۔ انسانی حریت و مساوات کی جنتِ ارضی، اسی کے ہاتھوں زیر و زبر اور پامال ہوئی تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی متاعِ حیات راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔ اور جب مغلوں کے زوال کے بعد یہاں یورپین جیک کی پرچم کشائی کا دور آیا تو مسلمان کی رگِ حیات اس خونِ گرم سے بے نصیب ہو چکی تھی جس کی حرارت نے اسے مدت تک ذوقِ سفر سے سرشار اور سرگرمِ تگ و تاز رکھا تھا۔

ایک صدی پہلے | ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی شدتِ جذبات کی آخری بھڑک ثابت ہوئی۔

ایسا نظر آتا ہے کہ کارگہِ سیاست کے شکست خوردہ مسلمان نے مرغِ بسمل کی آخری تڑپ سے کام لیا اور اپنی ناتوانیوں کے باوجود لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے نئے اور طاقتور حکمرانوں کو دعوتِ پیکار دیتا میدان میں نکل آیا۔ لیکن یہ جرأتِ رندانہ اسے بہت مہنگی پڑی۔ تیز مند شاطرانِ فرنگ کی عقابی نگاہیں اس حقیقت کو بھانپ چکی تھیں کہ جب تک یہاں کے مسلمانوں کو ان کے قومی تشخص اور احساسِ خودی سے کلیتہً محروم نہ کر دیا جائے، ان کا شاندار ماضی راکھ کے ڈھیروں سے غیرت کے شعلے بھڑکاتا رہے گا۔ وہ اپنی عظمتِ رفتہ کی بازآفرینی کے لئے ——— جذباتی طور پر ہی سہی، حرکت میں آتے رہیں گے اور غیر ملکی حکمرانوں کو نت نئے خطروں سے دوچار رکھیں گے۔ چنانچہ اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے انہوں نے ہندوؤں کو اپنی آغوشِ لطف و محبت میں لے لیا اور مسلمانوں کے رمقِ وجود کی رہی سہی حرکت کو ختم کرنے کے لئے جوشِ انتقام کا ہر ممکن حربہ بروئے کار لانا شروع کر دیا۔ آقائے فرنگ کی سرپرستی میں زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو کر برادرانِ وطن دیوانہ وار دفتری نظام کی طرف بڑھ رہے تھے اور وہ مسلمان جس نے ایک ہزار برس تک اس برصغیر میں اپنے اقتدار کا پرچم لہرایا تھا، اپنے نئے حکمرانوں کی آتشِ انتقام میں اپنی متاعِ حیات کو بھسم ہوتے دیکھ رہا تھا۔ محکومی و مظلومی، غربت و افلاس، بے بسی اور بے چارگی کے بھیانک سائے ہر چہار اطراف سے اسے اپنے حصار میں لے چکے تھے۔ اس کی زندگی کے قبرستانوں میں چاروں طرف مایوسی اور شکست کی نوحہ خوانیاں بپا تھیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ دم توڑتی قوم اس عالمِ سکرات میں ایک بار پھر کارگہِ حیات میں صف آرا ہو سکے گی۔ اور مؤرخ کا قلم اس کی نشاۃِ ثانیہ کی داستان تاریخ کے صفحات پر رقم کرے گا
۱۸۵۷ء میں ہم اپنی قومی زندگی کے نازک ترین مقام پر کھڑے تھے۔ کوئی معجزہ ہی ہمیں اس اندوہناک موت کی زد سے بچا سکتا تھا جو تیزی سے ہمارے دروازوں کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ لیکن قوموں کی موت و حیات کے قوانین کی معجز نمائیاں بھی کس قدر عجیب و غریب ہیں۔ یہ معجزہ بالآخر نمودار ہوا اور تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ ہم کس طرح زوال اور شکست کے افق میں ڈوب کر پھر آزادی و استقلال کے مطلع پر صورتِ خورشید ابھر آئے۔ کسی قوم کا زوال اور شکست کی ہچکیوں سے نجات پا کر از سرِ نو زندگی سے ہمکنار ہونا معمولی بات نہیں۔ بڑی ہی خوش نصیب ہے وہ قوم جسے یہ شرف حاصل ہو جائے اور مستحقِ تبریک ہیں وہ داعیانِ انقلاب، جن کی دعوتِ حیات ایسے معجزوں کی امین ثابت ہو

ان سطور میں ہمارا موضوع اپنی اسی نشاۃِ ثانیہ کی گراں مایہ یاد کو تازہ کرتے ہوئے ان جلیل القدر زعماء کے مقام و پیام کو قارئین کے سامنے لانا ہے جو ہمارے سفینۂ حیات کو بھنور سے بچا کر ساحلِ مراد تک لے آئے اور ان کے عزم و استقلال اور دعوتِ انقلاب نے ہمیں دنیا کی آزاد قوموں کے دوش بدوش گامزن ہونے کے قابل بنا دیا۔ تاریخ بتائے گی کہ زندگی کے نازک ترین موڑ پر اگر ہمیں ان عظیم و جلیل راہ نماؤں کی قیادت نصیب نہ ہوتی تو آج ہمارے سروں پہ آزادی کا ہلالی پرچم سایہ فگن نہ ہوتا بلکہ اغیار کی غلامی اور محکومی میں ہماری بے بسی اور بے چارگی صفحۂ تاریخ پہ ذلت اور شکست کا بدنما داغ بن کر

ثبت ہو جاتی -

زعیمِ اوّل ——— سر سیّد احمد خانؒ

ہماری نشاۃِ ثانیہ کی اس داستان میں سر سید علیہ الرحمۃ کی نادر الوجود شخصیت نقیبِ اوّل کی حیثیت سے ابھر کر نگاہوں کے سامنے آتی ہے۔ وہی سر سیدؒ جو لنکوٹے اڑاتا اور صدر امینی کے دفتر میں معمولی سر رشتہ دار کی حیثیت سے کام کرتا مرکزی لیجسلیٹو کونسل کی رکنیت تک پہنچا۔ اور پھر اس کے بعد ملت کے تقاضوں پر لبیک کہتا ہوا، سارے اعزازات کو بالائے طاق رکھ کر، اس جذبۂ جنون اور عزم و استقلال کے ساتھ میدانِ عمل میں آیا کہ اس کے جوششِ عمل نے اس برِصغیر کی تاریخ کا رُخ بدل دیا۔ اور ملتِ اسلامیہ اپنے عہدِ شرف کی گم گشتہ منزلوں کا سراغ پانے کے قابل ہو گئی۔ شہرۂ آفاق ترک خاتون خالدہ ادیب خانم نے اس زعیم ملت کی عظمت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کس قدر درست کہا تھا کہ:-

> سر سیدؒ کو کسی پہلو سے بھی دیکھا جائے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑا بھاری پتھر تھا جو اسلامی سوسائٹی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لڑھکا دیا گیا اور اس نے جو لہریں پیدا کیں وہ آج تک برابر حرکت میں ہیں خواہ وہ ہمیشہ اس سمت میں نہ ہوں جسے سر سیدؒ پسند کرتے تھے۔
>
> (مقدمہ حیاتِ جاوید) (بحوالہ علی گڑھ میگزین)

عقل و فکر کی دعوت

سر سیدؒ قومی زوال اور شکست کے جس ماحول میں مردانہ وار آگے بڑھے آج اس کا صحیح صحیح جائزہ لینا اور اندازہ لگانا آسان نہیں جذبات کے دھاروں پر بہتے ہوئے، سر سیدؒ کو اندھا دھند ہدفِ "تنقید" بنایا جا سکتا ہے اور بعض گرم جوش حلقے آج بھی ایسا کھیل کھیلنے پر نازاں ہیں لیکن ہے کوئی جو علیٰ رؤس الاشہاد اس کا جواب دینے کی جرأت کرے کہ اگر سر سیدؒ کا عزم و فراست اور عملی اندازِ فکر اس نازک اور کڑے وقت پر اپنی قوم کو پیشِ نظر حقائق پر سنجیدگی سے غور و فکر کی دعوت نہ دیتا تو آج ہمارا حشر کیا ہو چکا ہوتا؟

مشہور برطانوی مدبر ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی اشتعال انگیز کتاب "انڈین مسلمانز" میں مسلمانوں کے خلاف جو کچھ لکھا تھا اس نے انگریز حکمرانوں کے دلوں میں غیظ و غضب کے شعلے بھڑکا دیئے تھے۔ برطانوی حکومت کے خلاف مسلمانوں کی طبعی دشمنی ثابت کرتے ہوئے ڈاکٹر ہنٹر نے اپنے جوشِ بیان میں تحریر کیا تھا کہ:-

> مسلمان ایک ایسی قوم ہے جو گورنمنٹ سے لڑنا اور جہاد کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے اور کسی بھی طرح گورنمنٹ کی خیر خواہ نہیں بن سکتی۔

ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی اس کتاب میں علمائے اسلام سے ایک استفسار کیا تھا اور حالات اس قدر نازک تھے کہ کسی سے اس کا دو ٹوک جواب دینے کی جرأت نہ ہو سکی تھی۔ ڈاکٹر ہنٹر کا سوال یہ تھا کہ:-

> اگر کوئی مسلمان بادشاہ ہندوستان پر حملہ کرے تو کیا اس ملک کے مسلمانوں کو انگریز حکومت

کی امان ترک کرنی اور غنیم کی امداد کرنی جائز ہو گی ؟

حق گوئی و بے باکی

سوچئے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ ہند کے بعد جب کہ دلوں پر خوف و ہراس کے پردے بٹھا دیئے گئے تھے اور زبانوں پر سکوت کی مہریں لگ چکی تھیں، اس نازک سوال کا مسکت اور دو ٹوک جواب کس طرح اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا لیکن اس سوال کا جواب دیا گیا۔ یہ صرف سرسید علیہ الرحمۃ تھے جنہوں نے جواباً ہر خوف سے بے نیاز ہو کر "آئینِ جواں مرداں" کی لاج رکھی اور گرج کر کہا کہ :-

کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ کل کو کسی بڑے ہنگامے میں قوم کا کیا حال ہو گا۔ لیکن میں یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایسی حالت میں مسلمان وہی کچھ کریں گے جو ان کی پولیٹیکل حالت ان سے کرائے گی۔

اور حکمرانوں کے دلوں نے شہادت دی کہ سچے مسلمانوں کا جواب اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد مسلمانوں کو جس قیامت سے گزرنا پڑا، اس نے سرسید کی زندگی بدل کر رکھ دی۔ مولانا حالی نے "حیاتِ جاوید" میں ان کے ایک دوست کا یہ قول نقل کیا ہے کہ :-

"۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے سرسید کے دل پر وہ کام کیا جو لوتھر کے دل پر بجلی کے گرنے نے"۔ حالات گواہ ہیں کہ ملت کا جو حشر ہوا اس نے ہمیشہ کے لئے سرسید کی زندگی کا سکون اور اطمینان چھین لیا اور اس کے بعد قوم کو موت سے بچانے کے لئے وہ ساری زندگی آتش زیرِ پا رہے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (۲۸ دسمبر ۱۸۸۹ء) میں انہوں نے خود اپنی تفسیر میں کہا تھا :-

میں اس وقت ہرگز یہ نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپ سکے گی اور از سرِ نو عزت پانے کے قابل ہو جائے گی .... آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بوڑھا کر دیا، اور میرے بال سفید ہو گئے۔

جُدا گانہ منزل

مسلمانوں نے جس مقصدِ عزیز کے لئے غیر ملکی سامراج کے خلاف سر دھڑ کی بازی لگائی تھی اور اپنی جان کو جوکھوں میں ڈالا تھا۔ اس کا تعلق محض ان کی اپنی آزادی سے نہیں تھا بلکہ وہ پورے برِّصغیر اور برادرانِ وطن کو بھی آزاد دیکھنا چاہتے تھے لیکن جب اس راہ میں ناکامی کے بعد مسلمانوں کو حکومت کے تند و تیز انتقام کا شکار ہونا پڑا، تو برادرانِ وطن نے کلیتہً آنکھیں پھیر لیں۔ وہ نہ صرف دفتری نظام میں حکومت کے دست و بازو بن گئے بلکہ زندگی کے ہر میدان میں مسلمانوں کے خلاف محاذ کھڑا کر دیا۔ سرسید نے کم و بیش دس برس تک انہیں محبت اور رواداری سمجھانے کی کوشش کی، لیکن جب دیکھا کہ اس کا الٹا اثر ہو رہا ہے اور (اور تو اور) اُردو زبان کو مٹانے کے لئے محض اس لئے پنجاب سے بنگال تک فتنہ برپا کر دیا گیا کہ یہ زبان مسلمانوں کے دورِ اقبال کی یادگار ہے تو انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ مسلمانوں کو اپنی جداگانہ منزلِ مقصود کے لئے سامانِ سفر باندھنا چاہیئے۔ ان کی آواز پورے ملک میں گونجی جب انہوں نے کہا کہ :-

مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ دونوں قومیں اب کسی کام میں بھی دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو

کچھ بھی نہیں ہوا۔ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا یہ مخالفت اور عناد ان ہندوؤں کے سبب ابھرے گا، جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں۔ جو زندہ رہے گا دیکھ لے گا۔ (حیاتِ جاوید)

سرسید نے یہ الفاظ ۱۸۶۷ء میں کمشنر بنارس مسٹر شیکسپیئر کے ایک سوال کے جواب میں کہے تھے۔ اس پیشین گوئی کے ایک ایک لفظ پر غور کیجئے کہ اسّی برس کے اندر اندر یہ الفاظ کس طرح قاضیٔ تقدیر کا اٹل فیصلہ بن کر محسوس و مشہود اور جیتی جاگتی تاریخی حقیقتوں میں ڈھل گئے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں اس داستان کا آخری باب تکمیل پا گیا۔

قومی تعلیمات کا تعمیری مرحلہ

۱۸۶۷ء میں سرسید نے اپنے جداگانہ قومی مستقبل کی جزئیات متعین کر لی تھیں۔ ان کے ذہن میں اس تعمیرِ ملّی کے خاکے ترتیب پا رہے تھے۔ افرادِ ملّت کی تعلیم و تربیت اور ان کے فکر و شعور کا نشو و ارتقاء ان کے تعمیری منصوبوں کی اساس قرار پا چکا تھا۔ اسی مقصد کے لئے انہوں نے حالات کی انتہائی ناسازگاری میں انگلستان کا سفر اختیار کیا؛ اور واپسی پر علی گڑھ کے اس فقید المثال دارالعلوم کی تعمیر میں منہمک ہو گئے جہاں سے ایک افسردہ و نیم مردہ قوم کے نونہال ستارے بن کر ابھرے اور اس کا افقِ تقدیر ایک بار پھر ان ستاروں کی تابانیوں اور ضوفشانیوں سے جگمگا اٹھا۔

قومی تعلیمات کے اس مرکزِ عظیم کی تعمیر و ترقی کے جنون میں سرسید نے کس طرح اپنی جان لڑا دی۔ یہ ایک الگ داستان ہے جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہ اس سے قبل پیدا ہو سکی اور نہ شاید اس کے بعد ہو سکے۔ اسی دور کے تعلیمی کمیشن کے چیئرمین مسٹر وآرڈ نے جب پہلی بار اس دارالعلوم میں قدم رکھا تو اپنی ڈائری میں اس نے تحریر کیا کہ:-

> جس وقت میں نے ان کمروں کی قطاروں کو دیکھا جو مکمل ہونے کے بعد دنیا میں اپنی قسم کی عمدہ ترین عمارتیں ہوں گی تو میں نے محسوس کیا کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہوگا جس کے دل میں ان مکانات کو دیکھ کر نئی ہمت پیدا نہ ہو۔ جب تک یہ عمارتیں قائم ہیں مسلمان یہ دعوے کر سکتے ہیں کہ ہم مرے ہوئے بھی وہ کام کر سکتے ہیں جو زندوں سے نہیں ہو سکتے۔

(حیاتِ جاوید)

مشہور فاضل انگریز سر آکلینڈ کالون نے سرسید کی وفات پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے مرحوم کے اسی شاہکار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ

> جس شخص کو آج آپ رو رہے ہیں وہ اس قدر مفلس تھا کہ اس کے پاس نہ رہنے کو گھر تھا، نہ مرنے کو، لیکن وہ آپ کے لئے ایک گراں مایہ خزانہ چھوڑ گیا اور یہ نشانِ منزل دے گیا کہ تعصب اور جہالت کے مقابلے میں شریفانہ جنگ جاری رکھو۔ (حیاتِ جاوید)

وحدتِ خیال کا مرکز

علی گڑھ کے اس عظیم الشان دارالعلوم کا مقصد محض نئی نسل کی تربیت نہ تھا بلکہ اس سے کہیں آگے تھا۔ ہمارے نامور ادیب صلاح الدین احمد کے

الفاظ میں سرسیدؒ کی دوربین نگاہوں کے سامنے اس سے کہیں اہم منزل کچھ اور تھی اور وہ یہ کہ :-

وہ علی گڑھ کو مسلم لیڈر شپ کے لئے ایک زندہ و پائندہ تربیت گاہ بنانا چاہتے تھے۔ سرسیدؒ کی دوربینی نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ جو کام وہ اپنی زندگی میں شروع کر جائیں گے اس کے جاری رہنے، فروغ پانے اور محیطِ کل ہو جانے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ پروگراموں کی بجائے وہ پروگرام بنانے والے پیدا کریں جو اپنے زمانے کے مطابق اس عظیم خاکے میں رنگ بھرتے چلے جائیں جو انہوں نے ملتِ اسلامیہ کی فلاحِ عام کے لئے تیار کیا تھا۔ . . . . چنانچہ علی گڑھ کو انہوں نے اس نمونے پر تیار کیا تھا کہ وہ مسلمانانِ ہند کی وحدتِ خیال کا مرکز بن گیا اور رنگ داری اور رہبری کی تمام لہریں یہاں سے منتشر ہوئیں وہ برِ عظیم ہند کے ہر گوشے میں پہنچ کر اثر آفریں ثابت ہوئیں۔

(مقالہ سرسید احمد خانؒ پر ایک نظر)

سرسیدؒ کا عظیم مشن ان الفاظ سے بخوبی واضح ہوتا ہے جو انہوں نے طلبا نے دارالعلوم سے ایک خطاب کے دوران میں کہے تھے۔ انہوں نے اپنے شاہین بچوں پر واضح کیا تھا کہ :-

یاد رکھو! سب سے سچا کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ہے۔ اسی پر یقین رکھنے کی بدولت ہماری قوم، ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر تم اگر آسمان کے ستارے بھی ہو گئے تو کیا! مجھے امید ہے کہ تم، علم اور اسلام دونوں باتوں کے نمونے ثابت ہو گے اور جبھی ہماری قوم کو حقیقی عزت نصیب ہو گی۔

(حیاتِ جاوید)

اسلامی قومیت کا وجود کیونکہ وطن، رنگ اور نسل کی بجائے آئیڈیالوجی اور صرف آئیڈیالوجی کے اشتراک پر عمل میں آتا ہے اور عقیدۂ ایمان کی نظریاتی اساس پر مسلمان کیونکہ ایک الگ قوم و ملت کی حیثیت رکھتے ہیں، اس سلسلہ میں شاید یہ اس دور کی پہلی آواز تھی جسے قومی تعلیمات کے اہم ترین جزو کی حیثیت سے نئی نسل کے ذہن نشین کیا گیا۔ یہ تصور تھا جو نوجوانانِ ملت کے قلوب میں بویا گیا اور نظریہ پاکستان کی کونپلیں بن کر آہستہ آہستہ برگ و بار لایا۔

خلوص و ایثار کا مظہر

یہ تھا جداگانہ اسلامی قومیت کا وہ بیج جو علی گڑھ میں بویا گیا۔ اس کی تربیت اور نشو و نما کے ممکن مواقع بہم پہنچائے گئے۔ اسی کے لئے وہ ذہنی جمود توڑا گیا جس کے مذہبی اجارہ داروں نے اس زعیمِ ملت کے خلاف کفر بازی کا طوفان برپا کر دیا۔ لیکن یہ طوفان بادِ مخالف سرسیدؒ کو اس کے مقصدِ عزیز سے الگ نہ کر سکا۔ مخالفت کے اسی طوفان میں اُسے پنجاب کے مسلمانوں سے (لاہور میں) خطاب کرنے کا موقع ملا۔ یہ ایک تاریخی خطاب تھا اور صاف دکھائی دیتا تھا کہ زعیمِ قوم نے اپنے دل کے زخم وا کر کے زندہ دلانِ پنجاب کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ بڑی دل سوزی سے اس نے کہا تھا :-

بزرگانِ پنجاب! فرض کیجئے کہ میں بد عقیدہ ہوں۔ مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر و مرتد آپ کی قوم کی بھلائی کی کوشش کرے تو کیا آپ اس کو اپنا خیر خواہ اور خادم نہیں سمجھیں گے؟ آپ کی

دولت سرا بنانے ہیں جس میں آپ آرام فرماتے ہیں، یا آپ کے لئے مسجد بناتے ہیں، جس میں آپ خدائے ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں، چوہڑے، چمار، قلی، کافر، بت پرست، بدعقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں۔ مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانے کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ کسی کو اس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ پس آپ مجھ کو بھی اس مدرستہ العلوم کے قائم کرنے میں ایک قلی کی مانند تصور کیجئے اور میری محنت و مشقت سے اپنا گھر بنتے دیکھئے۔　　(حیاتِ جاوید)

۱۸۷۳ء کا یہ خطاب کس قدر اثر انگیز تھا، مولانا حالیؒ اس کا چشم دید خاکہ "حیاتِ جاوید" میں پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"یہ سماں مجھ کو ہمیشہ یاد رہے گا۔ سامعین پر ایک سکتے کا سا عالم طاری تھا۔ کوئی مسلمان ایسا نہ تھا جو زار و قطار نہ رو رہا ہو اور جو اپنی بساط سے بڑھ کر چندہ دینے پر آمادہ نہ ہو ... یہی الفاظ جو آج معمولی باتیں معلوم ہوتے ہیں، اس موقع پر جب سرسیدؒ کی زبان سے نکلے تھے تو ان میں کچھ اور ہی جادو بھرا تھا۔"

فکری جمود کے خلاف جنگ

سرسیدؒ ہر قیمت پر صدیوں کے قومی جمود توڑنے پر تلے ہوئے تھے انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ جب تک قوم میں یہ احساس نہ پیدا ہوگی کہ وہ مسلکِ تقلید کی زنجیریں توڑ کر نئے حالات اور نئے تقاضوں کے مطابق نہ سفرِ زندگی شروع کریگی اُنہ اس وقت تک عظمتِ رفتہ کی باز آفرینی کا کوئی امکان پیدا ہو سکے گا۔ چنانچہ جہاں انہوں نے قلوب و اذہان میں نئی روشنی پیدا کرنے کے لئے مرکزِ تعلیمات پر پوری توجہ مرکوز کی وہاں تحریروں اور تقریروں کے ذریعے قومی فکر و بصیرت اور اجتماعی شعور کو بھی جھنجھوڑنے کی کوشش کی۔ اس راہ میں انہیں مذہبی اجارہ داروں کی مخالفت کی جس شدت سے دوچار ہونا پڑا، اس نے ماضی کے سارے ریکارڈ مات کر دیئے۔ ان کے خلاف ہزاروں کی تعداد میں جو فتوے شائع ہوئے، ان میں اس گراں مایہ زعیم کو "شیطان الملعین لعین اور دجال" تک کہا گیا۔ اس کا قتل واجب قرار دیا گیا۔ لیکن اقبالؒ کے الفاظ میں:-

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا!

ان فتووں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا حالیؒ نے کس قدر درست کہا تھا کہ:-

"درحقیقت یہ کفر و ارتداد کے فتوے نہیں بلکہ سرسیدؒ کے اعلیٰ درجے کے مسلمان ہونے کے وثیقے ہیں۔ یہ تحفے انہی لوگوں کو نصیب ہوتے ہیں جو دنیا کی مخالفت کے خوف سے کبھی حق بات کہنے سے نہیں چوکے۔"　　(حیاتِ جاوید)

کیا تعصب کے یہ "شاہکار" اس دماغی انقلاب کی عظمت کو داغدار کر سکے؟ تاریخ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ سرسیدؒ نے اپنے مقامِ بلند سے ہمیشہ یہ سب کچھ مسکراتے ہوئے سُنا۔ اور اس کی روشن پیشانی پر کبھی شکن تک نہ اُبھری۔ اس کی عظمت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ اس سے دشمنی کے باوجود

برادرانِ وطن کے دلوں میں ہمیشہ یہ حسرت رہی کہ اے کاش! ان کے ہاں بھی کوئی سرسیّدؒ ہو۔ حیاتِ جاوید میں مولانا ذکاء اللہ کی تحریر کے حوالے سے الٰہ آباد کے جلسۂ عام میں ایک فاضل پنڈت کی تقریر کا ذکر کیا گیا ہے، جس میں کہا گیا تھا کہ

> ہم مسلمانوں سے دولت میں کہیں زیادہ ہیں تعلیم میں فائق ہیں، تعداد میں کہیں بڑھ کر ہیں لیکن افسوس کہ ہم میں کوئی سرسیّدؒ نہیں۔ بلکہ ہم میں سے بیس مل کر بھی ایک ہو جائیں تو سرسیّدؒ کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے۔

(۲)

حکیمِ انقلاب ـــــ علامہ اقبالؒ

انیسویں صدی کے آخر میں سرسیّدؒ ہم سے رخصت ہو گئے اور ایک ایسی قوم پیچھے چھوڑ گئے جس کے نونہالوں کے سینے قومی تعلیمات سے منور ہو رہے تھے۔ اس کے مسلکِ تقلید اور قدامت پرستی کے سانچے آہستہ آہستہ ٹوٹ رہے تھے اور ذہنی جمود کی برفانی سلوں نے پگھلنا شروع کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ درست تھا۔ لیکن جہاں تک ملّتِ اسلامیہ کی ذہنی نفسیات کا تعلق ہے، یہ مقام ہماری حیاتِ اجتماعی میں بڑا ہی نازک تھا۔ قوم کی روایات پرستی کی پرستش گاہوں سے نکل کر آزادیٔ افکار کی کھلی فضا میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کے احساسات جمود انگیزیوں نے اب صورتِ سیلاب اختیار کر لی تھی۔ اس کے خوابیدہ افکار نے کش مکشِ اضطراب سے دوچار ہوتا تھا۔ وقت کا اہم ترین تقاضا یہ تھا کہ افکار و احساسات کی شوخیاں اپنے بند توڑ کر بے باکی اور سرکشی پر نہ اُتر آئیں۔ انہیں زندگی کی مستقل اقدار کے ساحلوں میں پابند رکھنا اشد ضروری تھا۔ ظاہر ہے کہ جو قوم آئیڈیالوجی کے اشتراک پر زندگی کی گذرگاہوں کو طے کرنا چاہتی تھی اس کے لئے ان اقدار کا سرچشمہ خدا کی آخری کتاب کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

سرسیّدؒ کی وفات کے بعد کم و بیش پچیس برس تک قومی زندگی کا میدان ایسے حکیمِ انقلاب سے خالی رہا جو تقاضائے وقت کی اس پکار کا جواب دے سکے۔ قوم ایسے دانائے راز کی منتظر رہی جو ان اقدارِ حیات کو روحِ اسلام سے کشید کرے اور انہیں وقت کے تقاضوں کے مطابق عصرِ حاضر کی زبان اور الفاظ میں افرادِ ملّت کے ذہن نشین کر سکے۔ سرسیّدؒ کے بعد ربع صدی کا قیمتی عرصہ اسی محرومیٔ انتظار میں گزر گیا۔ اس دوران من حیث القوم اپنی منزل کا تعین کئے بغیر مسلمان، برادرانِ وطن کے ساتھ مل کر جذباتی تحریکوں میں مایوسیوں اور نامرادیوں کا شکار بنتے رہے اور پھر وہ دن آیا جب مایوسیوں کی اس تاریک رات میں ایک چراغ روشن ہوا اور یہ آواز سنائی دی:۔

اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہے تو ۔۔۔ ترے لئے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل

حکیمِ انقلاب کی دعوتِ قرآنی

یہ حکیمِ انقلاب علامہ اقبالؒ کی آواز تھی جو مشرق و مغرب کے علمی میکدوں سے نامراد لوٹا تھا اور قرآن کے بابِ عالی پر

دستک دی تھی۔ اور یہاں سے مالا مال ہونے کے بعد اُس نے قوم کو جوشِ مسرت سے پکارا تھا کہ :-

گوہرِ دریائے قرآں سُفتہ ام　　شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام
از تب و تابم نصیبے خود بگیر　　بعد ازیں نایدچو من مردِ فقیر

اور پھر واضح کیا تھا کہ :-

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اور قومی ذلت اور نامرادیوں کا بنیادی سبب بیان کرتے ہوئے کہا تھا :-

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

زندگی کی عظیم حقیقتوں کی یوں نقاب کشائی کرتا یہ دانائے راز ایک دعوت لے کر آگے بڑھا۔ یہ قوم کی بگڑی بنانے کی دعوت تھی ۔ مردانہ وار کارزارِ حیات میں رزم آرائی کا پیغام تھا۔ کس قدر سوز و ساز، تڑپ اور خلش مضمر تھی اس دعوت میں، جب اُس نے کہا :-

بیا تا کارِ ایں امت بسازیم
قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجدِ شہر
کہ دل در سینۂ مُلّا گدازیم

یہی وہ مبارک و مسعود شخصیت تھی جسے مبداءِ فیض کی کرم گستری سے وہ قرآنی بصیرت عطا ہوئی جس نے ہر کٹھن مرحلے پر ملت کے لیے نشانِ منزل اور قندیلِ راہ کا کام دیا۔

اسلامی قومیت کا تصوّر

علامہ اقبال اپنے مقام سے بخوبی آگاہ تھے وہ جانتے تھے کہ عملی سیاسیات میں قوم کی رہنمائی ان کے طبعی رجحان سے مناسبت نہیں رکھتی۔ ان کا مقام ایک عظیم القدر مفکر کا ہے، اور اسی مقام سے وہ قوم کو اس کی حقیقی منزلوں کا سراغ دے سکتے ہیں۔ ایک مفکرِ اسلام کی حیثیت سے انہوں نے سب سے پہلے جس سیاسی مسئلہ کی اہمیت کو بھانپا وہ قومیت کا مروّجہ مغربی تصوّر تھا۔ یہ تصوّر اسلام کے اس نظریۂ قومیت سے براہ راست متصادم ہوتا تھا جس کی رُو سے قوم کی تشکیل آئیڈیالوجی کے اشتراک پر ہوتی ہے، نہ کہ وطن، رنگ یا نسل کی اساس پر۔ مزید برآں علامہ اقبال ان ہولناک نتائج سے بھی پوری طرح باخبر تھے جو قومیت کے مغربی تصوّر کو قبول کرنے کی بناء پر ملتِ اسلامیہ کے متعلق کو لاحق ہو سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے یہی نعرۂ جہاد بلند کیا کہ وطن، مسلمانوں کی قومیت کی اساس نہیں بن سکتا۔ انہوں نے پوری قوت سے یہ آواز بلند کی کہ :-

اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے جم اور　　ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور　　تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

وطنی قومیت کے اس بُت کو جس کے حضور بڑے بڑے فقیہانِ حرم سجدہ ریز نظر آتے تھے، ضربِ کلیمی سے یوں پاش پاش کرتے ہوئے انہوں نے یہ کہہ کر اپنی ملّت کو اس کے گم گشتہ مقام سے خبردار کیا ہے:

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر ‌ ‌ ‌ خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار ‌ ‌ ‌ قوّتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں ‌ ‌ ‌ اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملّت بھی گئی

نیشنلزم کے دلفریب سومنات کے چنگل سے مسلمانوں کو باز رکھنے کے لئے اس حکیمِ انقلاب کی صدائیں برابر اس برصغیر کی فضاؤں میں گونجتی رہیں۔ وہ اپنوں اور بیگانوں، سب کو ملّتِ اسلامیہ کی ہیئتِ ترکیبی کی اصل حقیقت سے روشناس کراتے چلے گئے اور پوری بلند آہنگی سے انہوں نے نعرہ بلند کیا کہ:۔۔۔

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بِنا ہمارے حصارِ ملّت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

پھر ایک دن ان کی نگاہوں نے یہ جگر پاش منظر بھی دیکھا کہ چوٹی کے علمائے دین اور مفتیانِ شرحِ متین اپنی ملّت کو نیشنلزم کے بت کے سامنے سرِ نیاز خم کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ اس قیامت پر آنسو بہاتے اور سسکیاں بھرتے ہوئے انہوں نے یوں نوحہ خوانی کی:۔۔۔

چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد ‌ ‌ ‌ کہ جبریلِ امیں را دل خراشد
چہ خوش دیرے بنا کردند ایں جا ‌ ‌ ‌ پرستد مومن و کافر تراشد

سسکیاں اور اشک باریاں ابھی تھمی نہ تھیں کہ دہلی کی ایک مسجد کے منبر سے دیوبند کے شیخ الحدیث کا یہ نعرہ بلند ہوا کہ "قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ ایسا نظر آتا تھا کہ ایک چوٹی کے عالمِ دین کا یہ سرِ منبر یہ اعلان ایک نشتر تھا جس نے بسترِ مرگ پر سسکتے ہوئے حکیمِ انقلاب کا سینہ چھلنی کر دیا۔ اس کے قلب و نگاہ کی گہرائیوں میں ایک آگ سی بھڑک اٹھی اور آہِ آتشیں کی صورت میں یوں لبوں تک آئی:۔۔۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ!
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است؟
سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست

اور اس کے بعد ان کا جو تاریخی بیان منظرِ اشاعت پر آیا اُسے "معرکۂ دین و وطن" میں ہمیشہ ایک شاہکار کی حیثیت حاصل رہے گی۔

بانگِ رحیل

سنہ ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبالؒ کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (منعقدہ الٰہ آباد) کی مسندِ صدارت سے ملّت کو مخاطب کرنے کا موقع ملا۔ ان کا یہ خطبۂ صدارت ہماری تاریخ میں ایک سنگِ نشان کی حیثیت رکھتا ہے۔ صدیوں کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ گنگ و جمن کے سنگم پہ کھڑے ہو کر ایک حکیمِ انقلاب نے قوم کو اس کی گم گشتہ منزلِ مقصود کا سراغ دیا۔ یوں سمجھئے کہ یہ خطابیہ ایک اذانِ سحر تھی جو فضاؤں میں گونجی اور اسے سن کر خوابیدہ قوم انگڑائیاں سی لینے لگی۔ اقبالؒ نے کہا تھا :-

" ہندوستان کی تاریخ میں جو نازک وقت آج مسلمانوں پر آچکا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے اندر وحدتِ افکار و عمل پیدا کر کے مکمل طور پہ منظم ہو جائیں۔ ان کی یہ تنظیم ملّتِ اسلامیہ اور ہندوستان دونوں کے حق میں مفید ثابت ہوگی۔ ہندوستان کی غلامی ایشیا بھر کے لئے لامتناہی مصائب کا سرچشمہ بن رہی ہے۔ اس غلامی نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے اور اس ملک کو اظہارِ خودی کی اس مسرت سے محروم کر دیا ہے جس کے فیض سے یہ کبھی ایک عظیم الشان اور درخشندہ کلچر کی تخلیق کا موجب بنی تھی۔ جس سرزمین کے ساتھ ہماری زندگی اور موت وابستہ ہو چکی ہے اس کی طرف سے ہم پر ایک فریضہ عاید ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ہم پر ایشیا اور بالخصوص مسلم ایشیا کی طرف سے کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ تنہا ایک ملک میں سات کروڑ فرزندانِ توحید کی جماعت کوئی معمولی چیز نہیں، مسلم ایشیا کے ممالک مجموعی طور پہ اسلام کے لئے اتنی گراں بہا متاع نہیں جتنی اکیلے ہندوستان کی ملّتِ اسلامیہ۔ اس لئے ہمیں ہندوستان کے مسئلے کو صرف اس زاویۂ نگاہ سے ہی نہیں دیکھنا چاہئے کہ ہندوستان میں اسلام کا حشر کیا ہوگا؟ بلکہ اپنی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس نقطۂ خیال سے بھی کہ ہماری موت و حیات کا عالمِ اسلامی پر کیا اثر پڑے گا۔ ہندوستان اور ایشیا کی طرف سے جو فرائض ہم پر عاید ہوتے ہیں ہم ان سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے جب تک ہمارا نصب العین متعین نہ ہو اور اس کے حصول کے لیے ہم منظم طور پہ عزم نہ کریں۔ ہندوستان کے دیگر سیاسی گروہوں میں ہماری مستقل ہستی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم منظم، متحد اور ہم آہنگ ہوں۔ ہمارا بکھیرا ہوا شیرازہ ان تمام سیاسی مسائل پر جن سے ہماری ملّت کی زندگی اور موت وابستہ ہے، بُری طرح اثرانداز ہو چکا ہے۔ میں فرقہ وارانہ مسائل میں سمجھوتے کے بارے میں نا امید نہیں لیکن مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں شاید ایسے خطرناک حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمانوں کو اپنا جداگانہ محاذ قائم کر کے اس کا مقابلہ کرنا پڑے۔ ایسے خطرناک حالات میں آزاد راہِ عمل وہی قومیں اختیار کر سکتی ہیں جو حصولِ مقاصد کے لئے کلی یکجہتی ہوں۔"

(خطبۂ صدارت، الٰہ آباد ـــ بحوالہ طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۴۳ء)

اور پھر اس کے لئے لائحہ عمل تجویز کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا :-

" اگر آج آپ اپنے تمام تصورات اور تخیلات کو اسلام اور صرف اسلام کے نقطۂ ماسکہ پر مرکوز

کردیں اور زندہ پائندہ اور قائم و دائم نظریۂ حیات سے، جو وہ پیش کرتا ہے، نورِ بصیرت حاصل کریں تو اس سے آپ اپنی منتشرہ قوتوں کو پھر سے مجتمع اور گم گشتہ مرکزیت کو از سرِ نو حاصل کریں گے اور یوں اپنے آپ کو تباہی اور بربادی کے مہیب جہنم سے بچا لیں گے۔ (ایضاً)

اور ازاں بعد، اس دانائے راز کی شدتِ آرزو یوں لبوں پہ آئی:-

میری آرزو ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔ ہندوستان کو حکومت خود اختیاری زیرِ سایہ برطانیہ ملے یا اس سے باہر۔ کچھ بھی ہو مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔ (ایضاً)

اس الگ خطۂ زمین کا حصول اور اس جداگانہ مملکت کا قیام کیوں اشد ضروری تھا، اس کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ موصوف نے اسی خطبہ میں فرمایا:-

اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے ..... اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو اس سے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھ جائیں گی۔ (ایضاً)

انہوں نے مسلمانوں کی قومی امنگوں کی ترجمانی کرتے ہوئے اس کی مزید وضاحت کی اور کہا:-

یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس دلی خواہش پر مبنی ہے کہ انہیں بھی کہیں اپنی نشو و نما کا موقعہ ملے۔ اس لئے کہ اس قسم کے مواقع کا حاصل ہونا اس وحدتِ قومی کے نظامِ حکومت میں قریب قریب ناممکن ہے جس کا نقشہ ہندو اربابِ سیاست اپنے ذہن میں لئے بیٹھے ہیں اور جس سے ان کا مقصدِ وحید یہ ہے کہ تمام ملک میں مستقل طور پہ انہیں غلبہ اور تسلط حاصل ہو۔ (ایضاً)

اقبالؒ نے اس تاریخی خطبہ میں جو اٹل حقائق پیش کئے وہ ملت کے لئے تنظیم و عمل کا پیغام بھی تھے اور دعوتِ انقلاب بھی، کاروانِ ملت کے لئے اس میں منزل کی نشان دہی بھی تھی اور بانگِ رحیل بھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی انوارِ قرآنی سے فیض یاب نگہِ بصیرت پورے یقین و اعتماد سے دیکھ رہی تھی کہ جو کچھ وہ زبانِ حال سے کہہ رہا تھا وہ مستقبل کے افق پر محسوس و مشہور اور زندہ جاوید تاریخی حقائق کی صورت میں جلوہ بار ہو کر رہے گا۔

اسلام۔ ثبات و تغیّر کا حسین امتزاج

اقبالؒ نے ہمیں نہ صرف پاکستان کا تصور عطا کیا بلکہ اس حقیقت کی بھی وضاحت کر دی کہ جس اسلامی دستورِ حیات کو اس جداگانہ مملکت کی رُوح بننا ہے اس کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں۔ یہی خصوصیات ہیں جنہیں نگاہوں سے اوجھل کر کے ہم حصولِ پاکستان کے بعد پے در پے ناکامیوں، مایوسیوں اور گوناگوں الجھنوں کی گردشِ دولابی کا شکار ہو رہے ہیں۔ دیکھئے کہ انہوں نے اپنے خطبات ——— تشکیلِ الٰہیاتِ جدید ——— میں اس حقیقت کو کس قدر نکھار کر منظرِ عام پہ پیش کیا تھا۔ وہ فرماتے ہیں:-

> اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلّی کی روحانی اساس ازلی اور ابدی ہے۔ لیکن اسکی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلق کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق اور توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ دنیا میں، جہاں تغیر کا دَور دَورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان ہی نہیں ــــ وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے ــــ تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد اور متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی و سیاسی دوائر میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

یہ تھا اقبالؒ، وہ دانائے راز اور حکیم انقلاب، جس نے سرسیّد کی پھیلائی ہوئی روشنی میں کاروانِ ملّت کے ذوقِ سفر کا رُخ اس کی حقیقی منزلِ مقصود کی طرف پھیر دیا۔ جہاں سرسیّد نے صدیوں کے بعد پہلی دفعہ قوم کے فکر و بصیرت سے اپیل کی اور جذبات کے دھاروں پر بہنے کی بجائے زندگی کی عملی حقیقتوں سے عہدہ برآ ہونا سکھایا۔ وہاں اقبالؒ نے بھی اپنی حیات آفریں دعوت، علم و بصیرت کی روشنی میں پیش کی۔ یہی خوش گوار اور خوش آئند انقلاب تھا جو مدتوں کے بعد ہماری قومی زندگی میں بپا ہوا۔ یعنی قوم پہلی بار جذبات کی ہنگامہ خیزیوں اور پُرفریب نعرہ بازیوں سے دامن کشاں ہو کر سنجیدگی سے اپنے مقام اور منزل کو سمجھنے پر مائل ہوئی۔ اگر تاریخی نشیب و فراز کا حقیقت پسندی سے جائزہ لیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ ذہنی انقلاب معمولی کام نہ تھا بلکہ بہت بڑی معجز نمائی تھی جو خدائے ذوالمنن کی عنایاتِ بے غایات کے صدقے میں ہمیں نصیب ہوئی۔

ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

قائداعظم ـــــ محمد علی جناحؒ

زباں پہ بارِ الٰہا یہ کس کا نام آیا؟

سرسیّدؒ و اقبالؒ کی مساعیِ جمیلہ کے بعد جو عظمت آفریں شخصیت ہمارے سفینۂ حیات کی ناخدائی کے لئے آگے بڑھی اور اُسے ساحلِ مراد سے ہم کنار کر کے دَم لیا وہ قائداعظم محمد علی جناحؒ تھے۔ تاریخ شہادت دے گی کہ اس قائدِ جلیل کی شانِ قیادت نے اپنے تگ و تاز کے پورے دَور میں ایک لمحہ کے لئے بھی جذباتی رجحان کی دل فریبیوں کا سہارا نہیں لیا۔ ہندو قوم تعلیم و ترقی اور فکر و شعور کے میدان

میں مسلمانوں سے کس قدر آگے تھی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں بھی گاندھی جی جیسی شہرہ آفاق شخصیت کو، اپنی لیڈر شپ کا سکہ جمانے کے لئے مہاتمائی روپ دھارنا پڑا، اور وہی انداز اختیار کرنے پڑے جو ہندو کے جذبات کو اپیل کر سکیں۔ لیکن کیسا حیرت انگیز سیاسیاتِ ہند کی تصویر کا یہ دوسرا رُخ کہ جناحؒ مسلمانوں جیسی جذباتی قوم کی قیادت کے لئے میدان میں آئے اور انہوں نے قومی جذبات پر اثر انداز ہونے کے لئے اس قسم کا کوئی ادنیٰ کھیل کھیلنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ زندگی کے آخری سانس تک انہوں نے اس قسم کی دل فریب نمائشوں سے کلیتہً اجتناب کیا۔ یہی ہے جناحؒ کی عظمت کا وہ امتیازی نشان جسے ہم ان کے کمالات میں سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور یہی تھا ہماری فتح عظیم کا وہ حقیقی راز جو حصولِ پاکستان کا حقیقی امین قرار پائے گا۔

قیادتِ ملّی اور اقبالؒ کا حُسنِ انتخاب

اقبالؒ نہیں چاہتے تھے کہ وہ ایک مفکر کے مقام سے تجاوز کر کے اسلامیانِ ہند کے منصب قیادت کو اپنائیں — ان کے خلوص کا تقاضا یہی ہو سکتا تھا — ان کی نگاہیں اس قائد کی تلاش میں تھیں جو قومی زندگی کے لئے اور نازک ترین مرحلوں میں قیادت کی پُر پیچ ذمہ داریوں سے دو ٹوک انداز سے عہدہ برآ ہو سکے اور کوئی اس کی دیانت و امانت پر حرف گیری کی جراٗت نہ کر سکے۔ یہ صرف جناحؒ تھے جو ان کے حُسنِ انتخاب کے شایانِ شان قرار پا سکے اور ان کی کوششوں سے قوم کو وہ قائد مل گیا جس کے حُسنِ تدبّر کے صدقے میں پاکستان جیسی عظیم مملکت کا وجود نقشۂ عالم پر مرتسم ہوا۔ ۲۱ر جون ۱۹۳۷ء کو مسٹر جناحؒ کے نام ایک مکتوب میں اقبالؒ نے یہ لکھا تھا کہ

> ہندوستان میں آپ ہی کی ذات ایسی ہے جس سے قوم کو یہ امیدیں وابستہ کرنے کا حق حاصل ہے کہ مستقبل میں جو سیلاب آنے کا خدشہ ہے اس میں، صرف آپ ہی مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کر سکیں گے۔

یہ تھیں وہ امیدیں جو اقبالؒ نے قوم کی طرف سے جناحؒ سے وابستہ کیں اور تاریخ نے شہادت دی کہ جناحؒ نے انہیں بہ حسنِ کمال پورا کر دکھایا۔ اقبالؒ کے خطاب الٰہ آباد کے ٹھیک دس سال بعد جناحؒ ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان کو لے کر میدان میں آ چکے تھے اور اس کے بعد اس قرارداد کو حاصلِ مراد تک پہنچانے کے لئے دس کروڑ مسلمانوں کی وہ تگ و تاز شروع ہو گئی تھی جو ۱۹۴۷ء میں حصولِ پاکستان پر منتج ہوئی۔ اس مدت میں قائدِ اعظمؒ کی معرکہ آرائیوں کی تفصیل تاریخ کا ایک مستقل باب ہے اور ایک الگ داستان۔ یہاں ہم قائد اعظمؒ کے بعض اہم خطابات سے ان مقاصد کو روشنی میں لائیں گے جو تحریکِ پاکستان کے لئے اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔

انہوں نے ۲۶ر دسمبر ۱۹۴۳ء کو کراچی میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی تقریب پر حاضرین سے پہلے یہ سوال کیا کہ:-

> وہ کون سا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں؟

وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے؟ اور وہ کون سا لنگر ہے جس کی بدولت اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟

اور پھر خود ہی ان اہم سوالات کے جواب میں فرمایا :-

وہ بندھن اور وہ رشتہ، وہ چٹان اور وہ لنگر، خدا کی کتاب عظیم، قرآن کریم ہے، مجھے یقینِ محکم ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی — ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسولؐ اور ایک اُمت۔

۸ر مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے واضح کیا کہ

ہندو اور مسلمان خواہ ایک ہی قصبہ یا گاؤں میں کیوں نہ رہتے ہوں، کبھی ایک قوم کے افراد نہیں بن سکتے۔ وہ ہمیشہ دو الگ الگ عناصر کی حیثیت سے رہے ہیں — پاکستان تو اسی دن وجود میں آگیا تھا جب (ہندوستان میں) پہلا غیر مسلم، مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب کہ یہاں ابھی مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی

(تقاریرِ جناحؒ، حصّہ دوم)

اور پھر اس کے بعد (۲۷ر نومبر ۱۹۴۵ء کو) ایڈورڈز کالج پشاور کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا :-

ہم دو قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر بھی ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین ہمیں ایک ایسا ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ ہم اسی ضابطۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

(ایضاً۔ صفحہ ۴۵)

۱۸ر مارچ ۱۹۴۴ء کو پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی سالانہ کانفرنس (منعقدہ لاہور) میں تحریکِ پاکستان کی اہمیت واضح کرتے ہوئے انہوں نے پنجاب کے مسلم طلباء کو ایک نئے عزم اور تازہ ولولوں سے سرشار کر دیا۔ اس تقریر میں انہوں نے فرمایا :-

پاکستان کے تصور کو، جو اب مسلمانوں کے لئے ایک عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے، مسلمانوں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ ان کی حفاظت، نجات اور تقدیر کا راز اسی میں مضمر ہے۔ اسی سے یہ آواز اقصائے عالم میں گونجے گی کہ دُنیا میں ایک ایسی مملکت معرضِ وجود میں آگئی ہے جو اسلام کی عظمت رفتہ کو از سرِ نو پھر زندہ کرے گی

(ایضاً۔ صفحہ ۵۰)

۱۸ر جون ۱۹۴۵ء کو قائداعظمؒ ایک بار پھر صوبہ سرحد کے شاہین بچوں کو ایک اہم پیامِ انقلاب دے رہے تھے۔ اس پیغام میں انہوں نے فرنٹیئر مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی وساطت سے اسلام کے نونہالوں پر واضح کیا تھا کہ :-

پاکستان سے مطلب یہی نہیں کہ ہم (غیر ملکی حکومت سے) آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے (درحقیقت) مراد وہ مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ یہ بیش بہا تحفہ اور خزانہ ہمیں وراثت میں ملا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس سے ہم خود ہی متمتع نہیں ہوں گے بلکہ ہمارے ساتھ اور بھی فیض یاب ہوں گے ..... ہم نے صرف اپنی آزادی حاصل نہیں کرنی بلکہ اس قابل بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں اور اسلامی تصوّرات اور اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ (ایضاً۔ ص۳۶۷)

مملکت کا اسلامی تصوّر

قائداعظمؒ کے خلاف مفاد پرست گروہ کی طرف سے ہمیشہ یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ وہ اسلام کے معاملہ میں نابلد سے تھے۔ قائداعظمؒ نے مخالفت کے اس گھناؤنے انداز کا جواب ہمیشہ خود اعتمادی کی مسکراہٹ سے دیا۔ یوں کہ ملّت کے عظیم ترین قائد کی حیثیت سے انہوں نے اپنے قافلے کو جس اسلامی منزل کی طرف آگے بڑھایا تھا اس کی موجودگی میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اسلام کے زندہ و پائندہ حقائق سے بے خبر رہتے۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں فقہی موشگافیوں کا درک حاصل نہ ہو (اگرچہ ایک بلند پایہ بیرسٹر کی حیثیت سے انہیں محمڈن لاء پر کامل عبور حاصل تھا)۔ لیکن جہاں تک اسلام کی دینی عظمت و انفرادیت کا تعلق ہے انہوں نے اس کی روح تک سمجھنے میں پوری عرق ریزی سے کام لیا تھا۔ اس سلسلے میں ان کے گہرے اسلامی مطالعہ کا اندازہ اس انٹرویو سے بخوبی ہو سکے گا جو انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن کے طلبا کو دیا تھا۔ بڑے اہم سوالات کئے تھے ان طلباء نے اور ہم سطورِ ذیل میں اس سلسلۂ سوال و جواب کو بعینہٖ پیش کرتے ہیں جو اورینٹ پریس کی رپورٹ کے حوالے سے اپریل ۱۹۴۲ء کے طلوع اسلام میں شائع ہوا تھا:۔

سوال:۔ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب:۔ جب میں انگریزی زبان میں مذہب (RELIGION) کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورے کی رُو سے میرا ذہن لامحالہ خدا اور بندے کے پرائیویٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم نہیں۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ مُلّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعوےٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلام کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی۔ سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی

اصولی ہدایات اور طریق عمل نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے جو ملک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر کا تصوّر ناممکن ہے۔

سوال:۔ اسلامی حکومت کے تصوّر کی امتیازی خصوصیت کیا ہے؟

جواب:۔ اسلامی حکومت کے تصوّر کا یہ امتیاز پیشِ نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں، قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

ان الفاظ پر ایک بار پھر غور کیجئے کہ:۔

اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔

سنجیدہ فکر کا مطالبہ

کیا صدیوں کی ملوکیت کے بعد ایک مملکت کو اسلامی بنانے میں جو الجھنیں حائل رہی ہیں، انہیں ختم کرنے کے لئے یہ الفاظ قندیلِ راہ کی حیثیت نہیں رکھتے تھے؟ اگر ملّت جذبات پرستی سے بالاتر ہو کر حسنِ نیت اور خلوصِ فکر کی روشنی میں اپنا مستقبل متعین کرنا چاہتے تو اسے لامحالہ ان الفاظ کو مشعلِ راہ بنانا پڑے گا اور اس کے بغیر کوئی اور چارۂ کار نہ ہو سکے گا۔ سرسیدؒ۔ اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے اس بدنصیب قوم کو جذبات پرستی کی تند آندھیوں اور مسلک تقلید کی گہری تاریکیوں سے نکال کر فکر و بصیرت کی روشنی میں سفرِ زندگی طے کرنے کے قابل بنایا تھا۔ لیکن قوم کی بدنصیبی کی انتہا یہ تھی کہ حصولِ پاکستان کی فاتحانہ معرکہ آرائی کے بعد جب قیادت کا میدان خالی ہو گیا تو قوم کے جذبات سے کھیلنے والے مفاد پرست عناصر پھر آگے بڑھ آئے اور ہمارے سب سے بنیادی مسائل کو بھی جو انتہائی سنجیدہ فکر کے محتاج تھے، جذباتی رجحانات کے سپرد کر دیا۔

دوسری طرف وہ علماء جنہوں نے تحریکِ پاکستان کی اس شدّت سے مخالفت کی تھی، ہجوم کر کے پاکستان آ گئے اور آتے ہی یہ مطالبہ کر دیا کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اور یہ ہم ہی جانتے ہیں کہ اسلام کیا ہے اس لئے اس کی زمام اقتدار ہمارے حوالے کرو۔ اقبالؒ اور قائداعظمؒ دونوں کے دل میں یہی خطرہ تھا کہ تھیاکریسی کو ختم کرنے کے

لئے مملکتِ پاکستان کے حصول کی کوشش کی جا رہی ہے، کہیں وہی تھیاکریسی یہاں قائم نہ ہو جائے۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد اسی تھیاکریسی کی یہاں بنیاد رکھ دی گئی اور چونکہ یہاں نہ اقبالؒ موجود تھا نہ قائداعظمؒ، اس لئے ان حضرات کو کھل کھیلنے کا موقعہ مل گیا۔ ان حضرات نے، مذہب کے نام کا پورا پورا فائدہ اٹھا کر، اپنے مسلسل پروپیگنڈہ سے اس جذباتی قوم کے جذبات کو اور بھی شدت سے مشتعل کر دیا۔

سرسیدؒ کی کامیاب قیادت سے قبل بھی ہمارے عوام مدتوں جذباتی شورشوں میں مگن چلے آئے اور ان شورش پسندیوں نے ان کی اجتماعی قوت کو مضمحل بنا کر رکھ دیا۔ سرسیدؒ کی صحت مند اور مضبوط قیادت نے بے نتیجہ شورشوں اور ہنگاموں کی اس نمائش کو ختم کیا اور افرادِ ملت میں یہ صلاحیت بحال کی کہ وہ مسائلِ زندگی سے عقل و فکر کی سنجیدگی کے ذریعے عہدہ برآ ہوں۔ ہنگامہ خیزیوں اور زوال پذیریوں کے اس ماحول میں یہ کارنامہ بہت بڑا معجزہ تھا۔ سرسیدؒ کے بعد اقبالؒ آئے اور بصیرتِ قرآنی کی جلوہ باریوں سے ہر نشیب و فراز میں افکارِ تازہ کی روشنی پھیلا دی۔ اور قوم کا رُخ نشانِ منزل کی طرف پھیر دیا۔

قومی زندگی کی یہ منزل بڑا ہی کٹھن مرحلہ ثابت ہوئی۔ یہاں سیاست کے مغربی تصوّرات نے ذہنوں پہ پورا تسلّط جما رکھا تھا۔ اگرچہ اقبالؒ کے انقلاب آفریں نغمے ان تصوّرات کا جادو توڑ چکے تھے لیکن ایوانِ حکومت کا ہر فیصلہ انہی کی رُو سے طے پاتا تھا۔ اور بین الاقوامی دائروں میں بھی انہی تصوّرات کی کارفرمائی قائم تھی۔ یہ شرفِ عظیم صرف قائداعظمؒ کی قسمت میں لکھا تھا کہ مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا دعوےٰ لے کر ان بارگاہوں میں داخل ہوں اور دلائل و براہین کی بے پناہ اور بے مثال قوّت سے نہ صرف مروّجہ سیاسیات کے مسلّمہ ضابطوں کو غلط ثابت کر دیں۔ بلکہ انگریز اور کانگریس جیسی عظیم الشان قوّتوں کو اپنے دعوے کی عظمت و صداقت قبول کرنے پہ مجبور کر دیں ـــــ آسمان کی نگاہوں نے اس صدی میں فراست اور تدبّر کا اس سے عظیم تر شاہکار نہیں دیکھا اور مملکتِ پاکستان کا وجود اس فتحِ مبین کی زندہ جاوید شہادت ہے۔

قائداعظمؒ کے اس شاہکار کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ انہوں نے قومی فکر و شعور کی سنجیدگی کو جو سرسیدؒ و اقبالؒ کی کاوشوں کا نتیجہ تھی بدستور قائم رکھا۔ ان کے مخالفین نے قدم قدم پہ عوامی جذبات کو اُبھارا۔ لیکن قائداعظمؒ کا ہر پیغام اور ہر خطاب فکر و بصیرت کی اسی سنجیدگی کا آئینہ دار تھا۔ لیکن یہ سب ان کی ذات کے ساتھ ہی ختم ہو گیا اور ان کے بعد، شاہین کا یہ نشیمن زاغوں کے تسلط میں آ گیا۔ (اقبالؒ)

باب المراسلات

تقیہ

سوال :۔ طلوع اسلام بابت اپریل ۱۹۸۳ء میں، نظریۂ ضرورت کے سلسلہ میں آپ کا مقالہ بڑا پُر از معلومات ہے۔ اس سے بہت سے چہرے بے نقاب ہو گئے۔ لیکن اس میں آپ نے تقیہ کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ حالانکہ عاصم نعمانی صاحب نے اپنے مضمون میں اس کا ذکر خاص طور پر کیا تھا۔ اگر آپ اس کی بھی وضاحت فرما دیں تو یہ خلش بھی دُور ہو جائے۔

طلوع اسلام :۔ ہم نے طلوع اسلام بابت فروری ۱۹۸۳ء میں اس سلسلہ میں لکھا تھا۔

> مودودی مرحوم تقیہ کے بھی قائل تھے۔ وہ اپنی تفسیر، تفہیم القرآن میں آل عمران کی آیت ۲۸ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ "اپنے بچاؤ کے لئے اگر بدرجہ مجبوری کبھی کفار کے ساتھ تقیہ کرنا پڑے تو وہ بھی اس حد تک ہونا چاہئے کہ ....."
>
> تقیہ (اور متعہ) اہل تشیع کے عقائد ہیں۔ ہم ان سے بحث نہیں کر رہے۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مودودی مرحوم کے نظریۂ ضرورت کا لازمی نتیجہ تھا کہ اس قسم کے عقائد کی بھی گنجائش پیدا کر لی جائے۔

نعمانی صاحب نے بے شک یہ سوال بھی اٹھایا تھا لیکن ہم نے (اپریل ۱۹۸۳ء میں) اس کی وضاحت سے اس لئے اجتناب کیا تھا کہ اس سے تقیہ کا مسئلہ سامنے آ جاتا تھا جو اہل تشیع حضرات کے بنیادی عقائد میں سے ہے، اور ہم اس قسم کے فرقہ وارانہ عقائد و مسالک سے حتی الامکان اجتناب کرتے ہیں۔ لیکن اب جو کہا جا رہا ہے کہ اس سے خلش باقی رہ جاتی ہے، تو ہم، مودودی مرحوم کی حد تک رہتے ہوئے اس کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں۔

قرآن کریم کے متعدد مقامات میں، جماعت مومنین کو، غیر مسلموں کے ساتھ دوست داری کے تعلقات استوار کرنے سے بڑی سختی سے منع کیا گیا ہے۔ (دیکھئے آیات

۳/۱۱۷-۱۹ ، ۴/۱۳۹ ، ۹/۲۳ ، ۵۸/۲۲) میں یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ وہ لوگ خواہ تمہارے ماں باپ، بہن بھائی یا دیگر رشتہ دار بھی کیوں نہ ہوں ان سے بھی دوست داری تعلقات نہیں رکھے جا سکتے۔ قرآن کریم میں دو ہستیوں کی زندگی کو مومنین کے لئے بہترین نمونہ (اسوۂ حسنہ) قرار دیا گیا ہے۔ ایک حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے حضور نبی اکرمؐ۔ حضرت ابراہیمؑ کے اس اعلان اور مسلک کا بالخصوص ذکر کیا گیا ہے جس کی رُو سے انہوں نے ان سب سے قطع تعلق کر لیا تھا جو ایمان نہیں لائے تھے۔ (۶۰/۴) ان میں سے کسی ایک مقام میں بھی استثنا نہیں کی گئی۔ یعنی یہ نہیں کہا گیا کہ "ہاں! اس قسم کے حالات میں تم ایسا کر سکتے ہو"

ان میں ایک آیت سورہ آلِ عمران کی (آیت ۲۸[1]) بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے:-

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۗ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝

مودودی مرحوم اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں اس آیت کا ترجمہ یوں لکھتے ہیں:-

مومنین، اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا ہمدرد اور دم ساز ہرگز نہ بنائیں۔ جو ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں یہ معاف ہے کہ تم ان کے ظلم سے بچنے کے لئے بظاہر ایسا طرزِ عمل اختیار کر جاؤ۔ مگر اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے۔ اور تمہیں اس کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

سب سے پہلے یہ امر دریافت طلب ہے کہ مودودی مرحوم نے جو کہا ہے کہ

ہاں! یہ معاف ظاہر ہے کہ تم ان کے ظلم سے بچنے کے لئے بظاہر ایسا طرزِ عمل اختیار کر جاؤ۔

تو یہ قرآنی آیت کے کون سے الفاظ کا ترجمہ ہے؟ آیت میں ایسا ہرگز نہیں کہا گیا کہ (ان کے ظلم سے بچنے کے لئے بظاہر ایسا طرزِ عمل اختیار کر جاؤ)۔ مودودی مرحوم کو اپنے "نظریۂ ضرورت" کے لئے تائید درکار تھی۔ اس کے لئے انہوں نے آیت تو قرآن کی لکھی اور ترجمہ اپنی منشاء کے مطابق کر دیا!

مودودی مرحوم نے (ترجمہ کے نیچے) حاشیہ میں لکھا ہے:-

یعنی اگر کوئی مومن کسی دشمنِ اسلام جماعت کے چنگل میں پھنس گیا ہو اور اسے ان کے ظلم و ستم کا خوف ہو تو اس کو اجازت ہے کہ اپنے ایمان کو چھپائے رکھے اور

---

[1] قرآن کریم کے بعض نسخوں میں اس آیت کا نمبر ۲۸ ہے۔ بعض میں ۲۹۔ تفہیم القرآن میں اس کا نمبر ۲۸ ہے۔

کفار کے ساتھ بظاہر اس طرح رہے کہ گویا انہی میں کا ایک آدمی ہے۔ یا کسی کا مسلمان ہونا ظاہر ہو گیا ہو تو اپنی جان بچانے کے لئے وہ کفار کے ساتھ دوستانہ رویہ کا اظہار کر سکتا ہے۔ حتّٰی کہ شدید خوف کی حالت میں جو شخص برداشت کی طاقت نہ رکھتا ہو اس کو کلمۂ کفر تک کہہ جانے کی رخصت ہے۔

اس کے بعد ہے :۔

لیکن انہیں انسانوں کا خوف تم پر اتنا نہ چھا جائے کہ خدا کا خوف دل سے نکل جائے۔ انسان حد سے حد تمہاری دنیا بگاڑ سکتے ہیں مگر خدا تمہیں ہمیشگی کا عذاب دے سکتا ہے۔ لہٰذا اپنے بچاؤ کے لئے اگر بدرجۂ مجبوری کبھی کفار کے ساتھ تقیہ کرنا پڑے تو وہ بس اس حد تک ہونا چاہئے کہ اسلام کے مشن اور اسلامی جماعت کے مفاد اور کسی مسلمان کی جان مال کو نقصان پہنچائے بغیر تم اپنی جان مال کا تحفظ کر لو ۔۔۔۔۔۔ (الخ) (تفہیم القرآن، جلد اول صفحہ ۲۴۳۔ ایڈیشن ۱۹۵۱ء)

یعنی مودودی مرحوم کے نزدیک مجبوری حالت میں مسلمان کو اجازت ہے کہ

وہ اپنے ایمان کو چھپائے رکھے اور کفار کے ساتھ بظاہر اس طرح رہے گویا انہی میں کا ایک آدمی ہے۔

آپ ذرا اس شخص کی قلبی کیفیت کا اندازہ لگائیے جسے اس طرح زندگی بسر کرنی پڑے کہ ایمان کو چھپا رکھا ہو اور کفار کے ساتھ بظاہر اس طرح رہے گویا انہی میں کا ایک آدمی ہے! مسلسل خوف و اضطراب اور نقاب پوشی کی زندگی!

قرآن کریم کی تعلیم کا مقصود و منتہیٰ سیرت سازی ہے۔ وہ ایسے انسان پیدا کرتا ہے جن کی کیفیت یہ ہو کہ:

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق

انہیں وہ مومن کہہ کر پکارتا ہے۔ ان کے برعکس دوسری قسم کی سیرت و کردار ہے جس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ: يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ (۳/۱۶۶)۔ ان کے دل میں کچھ اور ہوتا ہے، زبان پر کچھ اور۔ انہیں وہ منافقین کہہ کر پکارتا ہے اور بدترین خلائق قرار دیتا ہے۔ ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ: وَإِذَا لَقُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا ۚ وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ (۳/۱۱۸)۔ جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم صاحب ایمان ہیں اور جب وہ الگ ہوتے ہیں تو شدت نفرت و عداوت سے تمہارے خلاف غصے میں اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں۔

آپ سوچئے کہ ایک غیر مسلم، دل میں اپنا کفر چھپا کر مسلمانوں میں بظاہر مسلمان بن کر رہتا ہے۔ اور ایک مسلمان دل میں ایمان چھپا کر غیر مسلموں میں بظاہر انہی جیسا بن کر رہتا ہے، تو ان

دونوں کے طرزِ عمل میں فرق کیا ہے! دونوں اپنے ساتھیوں (یعنی ان لوگوں کو جن میں وہ رہتے ہیں) مسلسل فریب دیتے ہیں۔ کسی شخص کو ایک بار فریب دینے کے لئے آپ کے قلب و دماغ کو جس جس انداز سے پہلو بدلنے پڑتے ہیں وہی کچھ کم کرب انگیز نہیں ہوتے چہ جائیکہ کسی کو زندگی بھی اسی نہج سے گذارنی پڑے۔ اس کا دل بے شک اپنے ایمان کی طرف سے مطمئن رہے لیکن اس قسم کی تصنع اور بہروپ کی زندگی بڑی جگر سوز ہوگی۔ ایک مومن تو اس قسم کی زندگی بسر کرنے کے مقابلہ میں موت کو ہزار بار ترجیح دے گا۔

(۰)

اب آیئے آیت (۳/۲۸) کے صحیح مفہوم کی طرف۔ اسے ایک دفعہ پھر درج کیا جاتا ہے۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۗ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝

اس میں اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً کا ٹکڑہ غور طلب ہے۔

تقویٰ کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کسی چیز کی حفاظت کرنا۔ نگہبانی اور نگہداشت کرنا۔ اسے مضر اور تکلیف دہ چیزوں سے بچانا۔ اس اعتبار سے ان تمام امور سے بچنے کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جن سے محترز رہنے کا حکم خدا نے دیا ہے۔ بچنے اور محفوظ یا محتاط رہنے کے معنوں میں یہ لفظ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً کفار سے کہا: فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ (۲/۲۴) اپنے آپ کو بچاؤ اس آگ سے جس کا ایندھن الناس اور الحجارۃ ہیں۔ ایسا ہی مومنین سے کہا گیا۔ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ (۳/۱۳۱) اپنے آپ کو بچاؤ اس آگ سے جو کفار کے لئے تیار کی گئی ہے۔ یا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (۶۶/۶) بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل کو اس آگ سے۔ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ (۸/۲۵)۔ اس تباہی سے بچنے کا سامان کرلو کہ وہ جب آتی ہے تو انہی تک محدود نہیں رہا کرتی جو ظالم ہوں۔

جماعت مومنین کو متعدد مقامات پر تاکید کی گئی ہے کہ مخالفین کے خطرات سے بچنے کے لئے ہر قسم کا سامانِ حفاظت تیار رکھو خُذُوْا حِذْرَكُمْ (۴/۷۱)۔ اپنی سرحدوں کو محفوظ رکھو (۳/۲۰۰)۔ ان تصریحات کی روشنی میں واضح ہے کہ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً کے معنی ہیں، ان سے اپنی حفاظت کا انتظام پورا پورا رکھو۔ دوسری جگہ اس کی تشریح اور بھی واضح الفاظ میں کر دی۔ سورۃ آل عمران کی آیات (۳/۱۱۸-۱۱۹) دیکھئے۔ پہلے کہا کہ غیر مسلموں کو اپنا دوستہ دار اور راز داں مت بناؤ۔ اس کے بعد کہا کہ وہ تمہاری تخریب کے لئے ہر حربہ استعمال کریں گے لیکن تم گھبراؤ نہیں۔ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا (۳/۱۲۰)۔

اگر تم مستقل مزاج رہے، اور اپنی حفاظت کا انتظام رکھا تو ان کی سازشیں تمہیں کچھ نقصان پہنچا نہیں سکیں گی۔ (مولانا محمود الحسنؒ نے بھی "وَتَتَّقُوْا" کا ترجمہ "بچتے رہو" کیا ہے)۔

آیت (۱۲۰) میں دوسرا غور طلب لفظ اِلَّا ہے۔ سیوطیؒ نے (الاتقان جلد اول میں) اس کا ایک معنی "بلکہ" کیا ہے۔ یہی معنی اس آیت میں فٹ بیٹھتا ہے۔

اس کے بعد آیت (۲۸) کا مفہوم دیکھئے

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ جماعت مومنین کے لئے یہ قطعاً جائز نہیں ہوگا کہ وہ کفار کو اپنا دوست بنائیں۔ انہیں یہ تعلقات مومنین کے ساتھ ہی وابستہ رکھنے چاہئیں۔

وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ ۔ جو ان مخالفین کو اپنا دوست بنائے گا اس کا خدا کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہے گا۔

اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۔ اتنا ہی نہیں کہ تم ان سے دوست داری تعلقات نہ رکھو۔ تمہیں بلکہ ان سے بہت زیادہ محتاط رہنا چاہئے اور اپنی حفاظت کا پورا پورا سامان رکھنا چاہئے

وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۔ "تم اس سے نہ ڈرو کہ ان سے تعلقات منقطع کر لئے تو یہ تمہیں نقصان پہنچائیں گے۔ تمہیں ڈرنا اس سے چاہئے کہ قوانین خداوندی کی خلاف ورزی نہ ہو جائے۔

وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۔ اس لئے کہ تمہاری آخری پناہ گاہ بارگاہِ خداوندی ہے۔

یہ ہے مفہوم اس آیت کا جس سے یہ مطلب وضع کیا گیا ہے کہ مسلمان کو اپنا ایمان چھپا کر کفار کے ساتھ بظاہر اس طرح رہنا چاہئے گویا یہ انہی میں کا ایک آدمی ہے۔

اس مطلب کی تائید میں سورہ النحل کی آیت (۱۰۶) پیش کی جاتی ہے۔ یعنی

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۱۰۶)

اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے:-

> جو کوئی منکر ہو اللہ سے یقین لانے کے پیچھے، مگر وہ نہیں جس پر زبردستی کی گئی ہو اور اس کا دل برقرار ہے ایمان پر۔ لیکن جو کوئی دل کھول کر منکر ہوا، سو ان پر غضب ہے اللہ کا۔ اور ان کو بڑا عذاب ہے۔

عاصم نعمانی صاحب نے اپنے مضمون میں (یہ ترجمہ دینے کے بعد) کہا ہے کہ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مودودی مرحوم لکھتے ہیں:-

> اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جان بچانے کے لئے کلمۂ کفر کہہ دینا چاہئے۔ بلکہ یہ صرف رخصت ہے۔ اگر ایمان دل میں رکھتے ہوئے آدمی مجبوراً ایسا کہہ دے تو مؤاخذہ نہ ہوگا۔ ورنہ مقام عزیمت یہی ہے کہ خواہ آدمی کا جسم ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا

جائے۔ بہرحال وہ کلمۂ حق ہی کا اعلان کرتا رہے (تفہیم القرآن۔ جلد دوم۔ ص۵۶۵)
معلوم نہیں مودودی (مرحوم) "رخصت" اور "عزیمت" کا فرق کہاں سے لے آئے ہیں؟
اس آیت میں تو ایسا فرق نہیں کیا گیا؟
پھر تعجب ہے کہ جھوٹ بولنے کے معاملہ میں وہ یہ فرق نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں:

> راست بازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ بولنے کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔
> (ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۵ء)

جن حالات میں اس کے وجوب کا فتویٰ دیا گیا ہے، ان میں اس کی اجازت نہیں کہ اس شخص کا جی چاہے تو جھوٹ بولے اور جی چاہے سچ بولے۔ ان حالات میں اگر وہ سچ بولے گا تو گناہ گار ہوگا، کیونکہ واجب کا ترک کر دینا گناہ کا موجب ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ ایسا کرنا حکم خداوندی نہیں۔ یہ مفتی صاحبان کا فتویٰ ہے جس کی رُو سے جھوٹ بولنا واجب قرار دیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ فتویٰ مودودی مرحوم کے مفید مطلب تھا اس لئے انہوں نے اسے بطور سند پیش کر دیا۔

سورۃ النحل کی آیت ($\frac{16}{106}$) میں مَنْ اُكْرِهَ کہا گیا ہے۔ یعنی جسے مجبور کر دیا جائے۔

"مجبور کر دیا جائے"! ایسی حالت کا نام ہوگا جس میں اسے اختیار ہی نہ رہے کہ جو کچھ کفار چاہتے ہیں وہ اس کے خلاف کر سکے۔ کلمۂ کفر کہنے (یا نہ کہنے) میں تو اس شخص کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ یہ الفاظ کہے یا نہ کہے۔ جسے اس کا اختیار حاصل ہو وہ مَنْ اُكْرِهَ کے زمرے میں نہیں آئے گا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ کفار اس سے کفر کے ایسے کام زبردستی کرائیں جن کے نہ کر سکنے کا اسے اختیار نہ ہو۔ مثلاً اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے کسی بُت کے سامنے سجدہ ریز کرا دیا جائے یا اقرارِ کفر کی کسی تحریر پر اس کا زبردستی انگوٹھا لگا دیا جائے۔ ایسے کاموں میں وہ فی الواقعہ مجبور ہوگا۔

اگر بفرضِ محال آیت ($\frac{16}{106}$) کا یہ مفہوم بھی لے لیا جائے کہ اگر کوئی شخص تشدد سے مجبور ہو کر کلمۂ کفر کہہ دے تو وہ قابلِ مواخذہ نہیں ہوگا۔ تو اس سے تقیہ ضرورت ثابت نہیں ہو جاتا۔ اس سے اتنا ہی ثابت ہوگا کہ اس شخص میں تشدد برداشت کرنے کی سکت کم تھی۔ اس سے اس کا وہ ناجائز کام، جائز نہیں قرار پا جائے گا۔

توہم پرستانہ اسلام

(پرویز)

لنڈن سے ایک صاحب فکر و شعور، قرآنی رفیق کا گرامی نامہ موصول ہوا ہے۔ اُن کی خواہش ہے کہ اس کا جواب طلوعِ اسلام میں شائع کر دیا جائے تاکہ اس سے دیگر قارئین بھی مستفید ہو سکیں۔ میں اُن کی اس تجویز سے متفق ہوں۔ اُن کا مکتوبِ گرامی درج ذیل ہے:۔

"السلام علیکم۔ حال ہی میں دو ایسے واقعات پڑھنے اور سُننے میں آئے ہیں جنہوں نے یہاں کے اہلِ فکر طبقہ میں بڑا تحرک اور مُلّا زدہ لوگوں میں بڑی (EXCITEMENT) پیدا کر دی ہے۔ خبر یہ ہے: "چاند پر اُترنے والے پہلے امریکی خلا باز نیل آرمسٹرانگ حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے ہیں۔ یہ واقعہ ۱۹۶۹ء کا ہے۔ جب آرمسٹرانگ اپنی خلائی شٹل میں چاند کی طرف مائلِ پرواز تھا۔ اس نے بیرونی خلا میں ایک عجیب و غریب آواز سُنی۔ یہ آواز ہر روز کئی بار اس کے کانوں میں گونجی اس آواز نے چاند تک اس کا پیچھا کیا۔ آرمسٹرانگ جب زمین پر واپس آیا تو اس آواز کو بھول بھلا گیا۔ بعد ازاں وہ جب جامع الازہر کے معائنے پر قاہرہ میں تھا تو یہ عجیب و غریب آواز ایک بار پھر اس کے کانوں میں آئی۔ وہ حیران ہو گیا اور اپنے مصری میزبان سے اس آواز کے متعلق پوچھا۔ میزبان نے بتایا کہ یہ اذان ہے نماز کے لئے بلاوا جو قریبی مسجد سے بلند ہو رہا ہے۔ بس کیا تھا۔ آرمسٹرانگ کے دل و دماغ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ دل میں ایک ہل چل مچ گئی جو ان کے قبولِ اسلام پر منتج ہوئی"

(۲) ۱۳ مارچ بی بی سی ٹیلی ویژن نے (ASIAN MAGAZINE) پروگرام میں جناب قدرت اللہ شہاب کا ایک....... (RECORDED) انٹرویو دکھایا۔

اس سوال کے جواب کہ آپ نے شہاب نامہ میں (جس کی ابھی تک چند قسطیں ہی شائع ہوئی ہیں) کچھ ایسے واقعات بھی لکھے ہیں جن کی روشنی میں آپ کو بجا طور پر توہم پرست کہا جا سکتا ہے، شہاب نے فرمایا میں نے آج تک جو کچھ لکھا ہے وہ یا تو میرا ذاتی تجربہ ہے یا مشاہدہ۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ پھر یہ واقعہ سُنایا۔

"میں انڈین سول سروس میں تھا۔ بسلسلہ ملازمت اڑیسہ کے اس وقت کے دارالخلافہ میں جب جانا ہوا تو رہائش کے لئے میں نے ایک مکان کے متعلق دریافت کیا تو مجھے بتایا گیا کہ یہ مکان خالی پڑا ہے۔ اس میں کوئی رہتا نہیں۔ اگر کوئی رہتا بھی ہے تو چند دنوں کے بعد بھاگ جاتا ہے۔ یہ (HAUNTED HOUSE) ہے۔ میں نے وہ مکان لے لیا۔ ایک سال تک اکیلا اس میں رہا۔ اس عرصے میں ایک دن بھی ایسا نہ گزرا کہ وہاں وہ سب کچھ نہ ہوا ہو جو آپ (GHOST STORIES) میں پڑھتے ہیں۔ کبھی پتھر گرتے، کبھی آگ لگتی کبھی (CUPBOARD) کھولتا تو سانپ ہاتھوں میں آجاتا۔ الغرض طرح طرح کی انہونی باتیں ہوتیں۔ میں نے تفتیش شروع کی کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ مجھے پتہ چلا کہ ۱۸ برس پہلے یہاں ایک آفیسر آیا تھا۔ وہ ایک نوخیز معصوم ہندو لڑکی کو شادی کا چکمہ دے کر ساتھ لے آیا تھا۔ جب وہ لڑکی حاملہ ہوگئی تو اسے گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور اسی گھر میں دفن کر دیا۔ وہ لڑکی چاہتی ہے کہ اس کی ہڈیاں یہاں سے نکال کر اس کی ماں کی موجودگی میں (جو ۱۸ سال گزر جانے کے باوجود اپنی بچی کی آمد کا انتظار دیکھ رہی ہے) اس کے مذہبی عقیدے کے مطابق جلائی جائیں۔ میں نے حکومت کو اطلاع کی۔ پولیس کی نگرانی میں ہڈیاں نکال کر اس کی ماں کی موجودگی میں جلائی گئیں۔ اس کے بعد وہ گھر (HAUNTED HOUSE) نہ رہا۔"

مجھے بہت سے احباب نے فون کئے میں نے آرمسٹرانگ اور بالخصوص شہاب صاحب کی شخصیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان سب کو یہی جواب دیا کہ میں یہ دونوں واقعات محترم پرویز صاحب کو لکھ رہا ہوں آپ ان کے تبصرہ کا انتظار کریں۔

ان دو واقعات کو پڑھنے اور سننے کے بعد عام طور پر جس قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا وہ کچھ اس طرح کے ہیں:

(۱) موت کے بعد بھی روحوں کا اس دنیا سے رابطہ قائم رہتا ہے۔ ظلم و ناانصافی یا کسی گہرے عقیدے کی عدم تکمیل کے باعث وہ مضطرب و بے چین رہتی ہیں اور اپنی بے چینی کا اظہار مختلف صورتوں میں کرتی رہتی ہیں، تاآنکہ ان کی خواہش کے مطابق ان کے دکھ کا مداوا نہیں کر دیا جاتا۔

(۲) شعور کی اگلی سطح پر پہنچ کر بھی ہر روح انہی عقائد و نظریات کی حامل رہتی ہے جو اسے اس دنیا میں عزیز تھے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ وہاں پہنچ کر اصل حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے اور یوں نظریات و تصورات کے سارے اختلافات مٹ جاتے ہیں کچھ زیادہ وزنی بات معلوم نہیں ہوتی۔

(۳) یہ سچ ہے کہ اس دنیا میں آئے دن، کروڑہا انسانوں کو طرح طرح کے ظلم و ستم اور جور و تعدی کا نشانہ بنایا جاتا ہے اگر ان میں سے ہر ایک کی روح یوں اس دنیا پر یلغار کرنے لگے تو پھر یہ سارا جہان ایک (HAUNTED HOUSE) بن کر رہ جاتے لیکن یہ اس لئے نہیں ہو پاتا کہ جس طرح اس دنیا میں حضرت عمرؓ، آئن سٹائن، شیکسپیئر جیسی شخصیتیں وقت کے آسمان پر ثانوی تاروں کی مانند دکھائی دیتی ہیں اسی طرح ایسی روحیں جو اپنے کرب و بلا کی

بجلیاں اس دنیا تک پہنچا سکیں خالی خالی ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے واقعات کبھی کبھار دکھائی دیتے ہیں۔ مخلوق خدا کی اکثریت تو (EFFECT) ہی ہوتی ہے (CAUSE) ہونے کے اعلیٰ مقام پر تو صدیوں پر پھیلے ہوئے دور میں چند نفوس ہی فائز ہوتے ہیں۔

(۳) ۹ر مارچ کو ہماری بزم کی میٹنگ میں جو درس سنایا گیا اس میں آپ نے لفظ جنّ پر خصوصی روشنی ڈالی تھی۔ درس کے بعد احباب نے اسی موضوع پر کچھ دیر گفتگو جاری رکھی، ایک صاحب نے کہا کہ حال ہی میں میرے ایک دوست کا انتقال ہوا ہے۔ اس کے گھر کے تمام افراد اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ جس دن سے اس کی موت واقع ہوئی ہے رات کو جب بھی ہم کوئی لائٹ (ON) کرنا چاہتے ہیں تو وہ خود بخود (ON) ہو جاتی ہے۔ جس لائٹ کی ضرورت نہیں ہوتی وہ اپنے آپ بجھ جاتی ہے احباب کی متفقہ رائے یہ تھی کہ ایسی بات کرنے والے ذہنی مریض ہوتے ہیں اس لئے ان کی باتیں درخور اعتنا نہیں ہوتیں۔

ٹی وی پر شہاب صاحب کا انٹرویو دیکھنے کے بعد اس دوست نے مجھے فون کیا اور کہا۔ کیانی صاحب! مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا ہے۔ شہابؔ صاحب یقیناً ذہنی مریض نہیں ہو سکتے۔

(۴) "ملّا زدہ" لوگوں کو ختم، درود، پیر پرستی اور اس طرح کی دوسری بہت سی بدعتوں کے لئے ایک بہت بڑی سند مل گئی ہے۔

اگر آپ ان ہر دو واقعات اور ان سے پیدا شدہ خیالات پر کچھ تبصرہ کرنا مناسب سمجھیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ کم از کم قارئین طلوع اسلام کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔"

لندن میں سے ایک اور صاحب کا بھی اسی مضمون کا (انگریزی زبان میں) خط آیا ہے۔ چونکہ ہر دو خطوط کے متون یکساں ہیں، اس لئے اسے درج کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اس میں جو دو ایک مزید نقاط ہیں، اُن کا تذکرہ کر دیا جائے گا۔

(-)

مذکورہ بالا خط میں تین واقعات کا ذکر کیا گیا ہے (۱) آرمسٹرانگ کا قبولِ اسلام۔ (۲) شہاب صاحب کا بیان کردہ قصہ اور (۳) بجلیاں جلنے بجھنے کا واقعہ۔ ان میں شہاب صاحب کے بیان کردہ قصہ کی حیثیت مرکزی ہے اور تفصیل چاہتی ہے۔ اس لئے اسے میں آخر میں لوں گا۔ پہلے بقایا دو واقعات لئے جاتے ہیں۔

ا۔ نیل آرمسٹرانگ کا قبولِ اسلام۔ ہمیں کسی کی نیّت پر شبہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن آرمسٹرانگ نے جو قصہ بیان کیا ہے، اُس کی صحت قرینِ قیاس نظر نہیں آتی۔ یہ صاحب امریکہ کے شہری باشندے ہیں۔ اچھے لکھے پڑھے ہیں۔ اسے مشکل باور کیا جا سکے گا کہ انہوں نے نہ تو خلائی سفر میں جانے سے پہلے (ساری عمر) اذان کی آواز سنی ہو،

نہ وہاں سے واپسی کے بعد، دس بارہ سال تک، اس کا اتفاق ہوا ہو، درآنحالیکہ ذرائع مواصلات (ریڈیو۔ ٹی۔ وی، حتیٰ کہ سینما تک) کے عام ہو جانے سے، اذان کی آواز کسی نہ کسی نہج سے فضا میں گونجتی رہتی ہے۔

۲۔ اُس کے بیان کے مطابق خلائی سفر کی پرواز کے دوران اس آواز نے مسلسل اُس کا پیچھا کیا تا آنکہ وہ چاند پر اُتر گیا۔ اور جب زمین پر واپس آیا تو اس آواز کو بھول گیا۔ کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس قدر محیر العقول واقعہ کو زمین پر اُترتے ہی بھول گیا ہو؟ اُسے تو اس واقعہ کو اپنے سائنٹسٹ ہم دبستانوں سے سب سے پہلے بیان کرنا چاہئے تھا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو وہ اس کا سائنسی یا نفسیاتی تجزیہ کرکے بتاتے کہ اس آواز کی حقیقت کیا تھی۔ اُس نے ایسا نہیں کیا۔ علاوہ بریں اس نے متعدد انٹرویو دیئے تھے جن میں اپنے سفر کی ادنیٰ سے ادنیٰ جزئیات، مشاہدات، تجربات، اپنے جذبات اور احساسات تک بیان کئے۔ لیکن نہ بیان کیا تو یہ واقعہ جو اس قدر تحیر انگیز تھا کہ جب (اس بارہ سال کے بعد) اس کی یاد تازہ ہوئی تو اُس کے قلب و دماغ میں ہیجان پیدا ہو گیا اور وہ ہیجان اس قدر انقلاب انگیز تھا کہ اُس نے اپنے قدیم مذہب کو چھوڑ کر فوراً اسلام قبول کر لیا۔ نفسیات کا مبتدی بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ جو واقعات اس قدر ہیجان خیز ہوں وہ، اتنی جلدی تو کیا، عمر بھر بھولا نہیں کرتے۔

۳۔ ایک شخص اپنے مذہب میں رہتے ہوئے، اپنی ہم مذہب قوم کا فرد ہوتا ہے اور اسے کوئی خاص امتیازی مقام حاصل نہیں ہوتا تاکہ وہ کسی گوشے میں منفرد نہ ہو جائے، جس سے اسے خاص شہرت حاصل ہو جائے۔ لیکن اگر وہ دوسرا مذہب اختیار کرلے، تو اُس کی محض تبدیلیٔ مذہب ہی اُس کے لئے نمایاں عزت اور شہرت کا موجب بن جاتی ہے۔ اسلام قبول کرنے سے یہ شہرت بڑی آسانی سے حاصل ہو جاتی ہے۔ مسلمان اقوام ایک عرصہ تک مغرب کی سفید فام اقوام کی محکوم رہی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ (اس محکومیت کے ختم ہو جانے کے بعد بھی) ان (سفید فام اقوام) کی برتری کا احساس غیر شعوری طور پر اُن کے اعصاب و اذہان پر مسلط رہتا ہے۔ اگر ان (سفید اقوام کا) کوئی فرد اسلام لے آئے تو (بلا لحاظ اس امر کے کہ اس کی علمی یا ذہنی سطح کیا ہے) یہ اسے نیاز کے دانے کی طرح لئے لئے پھرتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات آئے دن ہمارے علم میں آتے رہتے ہیں۔ ان، مسلمان ہونے والوں میں سے، اکثریت ان کی ہوتی ہے جنہیں نہ اسلام کے متعلق کچھ علم ہوتا ہے، نہ ہی سوسائٹی میں ان کا کوئی علمی مقام۔ وہ مسلمانوں کے اس جذبہ کا استحصال کرتے ہیں۔ جب تک ان کے جلوس نکلتے رہتے ہیں، وہ ان کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس کے بعد ان کا پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ کہاں گئے؟ اکثر و بیشتر وہ اپنے سابقہ مذہب کی طرف لوٹ جاتے ہیں

۴۔ اگر کوئی اس قسم کی (EXPLOITATION) نہیں بھی کرتا، اور جذباتی طور پر مسلمان ہو جاتا ہے تو اس قسم کا اسلام جس قدر محکم ہو سکتا ہے، ظاہر ہے۔ آرمسٹرانگ صاحب کے کان میں اذان کی آواز پڑی، تو وہ مسلمان ہو گئے۔ اگر دوسرے سفر میں ان کے کان میں سنکھ کی آواز پڑ گئی تو کیا عجب کہ وہ ہندو دھرم اختیار کر لیں۔ اگر مذہب کی صداقت کا معیار کوئی محیر العقول واقعہ ہی ہو، تو ایسے واقعہ کی نسبت کسی مذہب کی طرف ہو، اُسے سچا مذہب سمجھ لیا جائے گا۔

۵۔ اسلام کی صداقت کا یہ معیار نہیں۔ وہ کچھ دعاوی پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ انہیں دلائل و براہین کی رُو سے پرکھو۔ اگر وہ اس کسوٹی پر پورے اُتریں اور اس طرح ان کی صداقت کے متعلق تمہارا قلب اور دماغ مطمئن ہو جائے تو اسے قبول کر لو۔ اس طرح قبول کیا ہوا اسلام، مستحکم ہوتا ہے اور توہم پرستی کا کوئی حادثہ اسے متزلزل نہیں کر سکتا۔ حضورؐ کے مخالفین آپ سے بار بار فرمائش (بلکہ مطالبہ) کرتے تھے کہ کوئی معجزہ دکھائیے تو ہم اسلام لے آتے ہیں۔ ہر بار ان کے مطالبہ کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا جاتا کہ اسلام اپنے دعاوی کو محیر العقول حوادث کے ذریعے عقل و فکر کو ماؤف کر کے نہیں منواتا۔ اس کے برعکس وہ کہتا ہے کہ قرآن نازل ہی اس لئے کیا گیا ہے: لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۲/۲۴۲ و دیگر آیات) ـــــ تاکہ تم عقل و فکر سے کام لینا سیکھو اور اس طرح اسے سمجھو۔ یہ ہے ہی اس قوم کے لئے جو عقل و فکر سے کام لے (لِقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ ۱۳/۴ و دیگر آیات)

۔ ہم نے چونکہ خود ہی اسلام کو دلائل و براہین کی رُو سے اختیار نہیں کیا، اس لئے جو کوئی بھی اسلام قبول کر لے (خواہ اس کا جذبۂ محرکہ کچھ بھی کیوں نہ ہو) ہم جشنِ مسرت منانے لگ جاتے ہیں اور ان سے بھی نہیں پوچھتے کہ اس نے اس کے دعاوی کو عقل و فکر کی رُو سے پرکھ کر، قبول کیا ہے؟ جس طرح ہم نے اسلام اختیار کر رکھا ہے۔ اگر کوئی اور بھی اس طرح اس "ہجوم مؤمنین" میں شامل ہو جاتا ہے، تو یہ چیز اسلام کی صداقت کا ثبوت نہیں ہو سکتی کہ ہم اسے دنیا کے سامنے فخر و مسرت کے ساتھ پیش کریں اور اسے اسلام کے لئے طرۂ امتیاز قرار دیں۔ مسٹر آرمسٹرانگ اپنے فنی کارنامے کے اعتبار سے بیشک عالمگیر شہرت کا حامل ہے۔ لیکن اپنے اسلام قبول کرنے کی جو وجہ وہ بیان کرتا ہے، اس میں اگر وہ ابلہ فریبی سے کام نہیں بھی لیتا تو بھی وہ جذباتی اور توہم پرست انسان نظر آتا ہے۔

اس قسم کا اسلام، قرآن کی میزان میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔ روایت میں ہے کہ جب حضور نبی اکرمؐ کا کمسن بیٹا فوت ہوا تو اتفاق سے سورج گرہن میں آگیا۔ عرب کا سا توہم پرست ملک۔ لوگ گروہ در گروہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ ہم اس

حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ آپؐ خدا کے سچے رسول ہیں۔ ہم اسلام قبول کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ امر بڑی مسرت کا باعث ہے کہ تم صداقت کا اعتراف کر رہے ہو، لیکن یہ بتاؤ کہ تم اسلام سے اس قدر مخالف تھے۔ اب کیا ہوا کہ تم یکایک اس کی صداقت کے قائل ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ آپؐ کی صداقت کا اس سے بڑھ کر ثبوت کیا ہوگا کہ آپؐ کے غم میں شرکت کے لئے سورج نے بھی ماتمی لباس پہن لیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر تمہارے اسلام قبول کرنے کا جذبہ محرکہ یہی ہے تو بہتر یہ ہے کہ تم اسلام قبول نہ کرو۔ چاند اور سورج کو خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق گہن لگتا ہے۔ اسے کسی انسان کے صدمہ سے کچھ تعلق نہیں۔ اس قسم کی توہم پرستی سے لایا ہوا اسلام نہ مستحکم ہو سکتا ہے، نہ ہی کچھ وقعت رکھتا ہے۔ تم جاؤ اور میرے دعاوی پر غور و فکر کرو۔

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ روزنامہ جنگ (لاہور) کی ۱۰ اپریل ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں حسب ذیل خبر نظروں سے گزری:-

> امریکہ کے خلا باز اور چاند پر قدم رکھنے والے دنیا کے سب سے پہلے انسان نیل آرمسٹرانگ نے اس امر کی تردید کی ہے کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ سعودی عرب کے اخبار "المدینہ" کے نامہ نگار مقیم واشنگٹن سے ایک خصوصی ملاقات کے دوران مسٹر آرمسٹرانگ نے اس سوال کے جواب میں ——کہ کیا واقعی انہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے؟—— کہا کہ وہ اسلام کا احترام کرتے ہیں لیکن انہوں نے کبھی اسلام قبول کرنے کا اعلان نہیں کیا۔

چلئے! قصہ کوتاہ گشت، ورنہ دردِ سر بسیار بود۔ معلوم نہیں وہ حضرات جو آرمسٹرانگ کے قبولِ اسلام کو، اذان کی عظمت کی شہادت کے طور پر پیش کرتے تھے، اب کیا کہیں گے؟ یاد رکھئے! اسلام اپنی صداقت کے ثبوت کے لئے اس قسم کی مخلوقی شہادات کا محتاج نہیں!

اب رہا بجلیاں روشن ہونے اور بجھ جانے کا واقعہ، تو ایسا نظر آتا ہے کہ انگلستان میں اس قسم کے واقعات نادر الوقوع ہیں جو اس پر اس قدر حیرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہاں اس قسم کے (بلکہ اس سے کہیں زیادہ محیر العقول) واقعات نئے دن ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی سا اخبار اٹھا لیجئے، اس میں اسی قسم کے کسی نہ کسی واقعہ کی خبر درج ہوگی۔ دو چار روز تک اس کا خاصہ چرچا رہے گا۔ پھر یا تو تحقیق و تفتیش کے بعد اس کے حقیقی اسباب بے نقاب ہو جائیں گے، یا وہ خود ہی اپنی ندرت کھو کر فضا میں تحلیل ہو جائے گی۔ جس انگلستان میں اب اس قسم کے واقعات (غالباً) نادر الوقوع ہیں، دو ایک صدیاں پہلے کوئی گھر خالی نہیں ہوتا تھا۔

جس میں اس قسم کی اعجوبہ خیزیاں یا شعبدہ بازیاں کارفرما نہ ہوں۔ وہاں سائنٹفک تحقیقات نے تاریکی کی اس چادر کو لپیٹ کر علم و فکر کی شمع جلا دی جس سے سانپ، سانپ۔ اور رسی، رسی نظر آنے لگ گئی۔ جس قدر کوئی ملک علم و تحقیق میں پیچھے ہوتا ہے، اسی قدر وہ توہم پرستی کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوتا ہے۔ آج بھی آپ، افریقہ یا آسٹریلیا وغیرہ کے اصل باشندوں کو دیکھئے، ان کی زندگی کی ہر نقل و حرکت توہم پرستی کی زنجیروں کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ خود ہمارے ہاں جس قدر جہالت ہے، اسی قدر توہم پرستی کی تاریکی ہے جسے کشف و کرامات، ورد و وظائف، گنڈا تعویذ کی چادروں سے ایسا مقدس بنا دیا گیا ہے کہ انہیں ہٹانا تو ایک طرف، کوئی انہیں چھونے تک کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس قسم کے محیر العقول واقعات، ناقابلِ فہم اس لئے رہتے ہیں کہ ہم ان کی تحقیق نہیں کرتے۔ ان کے متعلق عقیدہ یہ رکھتے ہیں کہ یہ فوق الفطرت واقعات ہیں جو اسباب و علل کی گرفت میں آ نہیں سکتے۔ روایات کی مبالغہ آمیزی اس عقیدہ کو اور بھی پختہ کرتی رہتی ہے۔ اس پر مستزاد ان کے ہتھکنڈے جن کا ذریعہ معاش ہی توہم پرستی ہے ——— ہر یک نخچیر، صد نخچیر گیر۔

اصل یہ ہے کہ انسان اپنے شعور کے عہدِ طفولیت کے تاثرات غیر محسوس طور پر اپنے ساتھ لئے چلا آ رہا ہے۔ بچپن میں ہمیں ہر بات محیر العقول نظر آتی ہے۔ جوں جوں ہم اشیاء و وقائع کائنات کو دیکھنے کے عادی ہوتے جاتے ہیں، ہمارا تحیّر کم ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ معمول کی ہر شئے اور ہر واقعہ "معمول" بن جاتا ہے۔ لیکن جب کوئی واقعہ غیر معمولی طور پر سامنے آئے، وہ محیر العقول نظر آتا ہے۔ اور اس میں ہم بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ خارقِ عادت، فوق الفطرت دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بعد جب ہم اس کے عادی ہو جاتے ہیں، اس میں وہ تحیراتی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ عصرِ حاضر کی سینکڑوں ایجادات، جو شروع شروع میں باعثِ صد حیرت (بلکہ ناممکن الوقوع) تھیں، اب معمولات میں شامل ہو چکی ہیں۔ خلافِ عادت واقعات کے متعلق ہماری حیرت کی فراوانی ہے جو انہیں کشف و کرامات تک کے مقام تک پہنچا دیتی ہے۔ یہاں پہنچ کر صورت یہ نہیں رہتی کہ ہر یک نخچیر صد نخچیر گیر۔ کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ——— صید خود صیاد را گوید بگیر۔

قرآن انسانی شعور کو عہدِ طفولیت سے نکال کر، دورِ شباب میں لے آتا ہے، جہاں وہ کہتا ہے کہ کائنات کا کوئی واقعہ علت و معلول کی کڑیوں سے ماوراء نہیں ہوتا۔ اگر وہ کڑیاں تمہیں نظر نہیں آتیں، تو اس میں "تخیلِ بلند" کا نہیں، تمہاری کوتاہ دستی کا قصور ہوتا ہے۔ ذرا علمی ہاتھ اونچا کیجئے۔ واقعہ کی علت تمہاری دسترس میں آ جائے گی۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اب آیئے اِس واقعہ کی طرف جسے شہاب صاحب نے بیان فرمایا ہے :-

میں یہ عرض کر دوں کہ شہاب صاحب سے میرا بڑا دیرینہ تعارف ہے اور میرے دل میں اُن کا بڑا احترام ہے۔ وہ بڑی خوبیوں کے انسان ہیں۔ پچھلی دفعہ جب وہ پاکستان تشریف لائے، تو معلوم ہوا کہ اُن کا رجحان تصوّف کے خلوتکدوں کی طرف ہو رہا ہے۔ اس سے مجھے بڑا افسوس ہوا کہ اتنی عمدہ صلاحیتیں ضائع ہو جائیں گی۔ قارئین کو علم ہوگا کہ میری (پہلی) آدھی زندگی انہی خلوتکدوں میں گزری ہے۔ اس لئے یہ میری شنید نہیں، بلکہ ذاتی مشاہدات، تجربات اور واردات پر مبنی ہے جو میں نے کہا ہے کہ ایسی گرانقدر صلاحیتیں بیکار چلی جائیں گی[1]۔ ان خلوت گاہوں میں داخل ہوتے وقت عقل و فکر کے جُوتے دروازے سے باہر اُتار دینے پڑتے ہیں۔ یہ صلاحیتیں بیکار ہی نہیں جاتیں، بڑا نقصان پہنچاتی ہیں۔ اس کی ایک مثال تو زیرِ نظر واقعہ میں ہی سامنے آجاتی ہے۔ اس واقعہ سے جو نتائج مستنبط کئے گئے ہیں، وہ (جیسا آگے چل کر بیان کیا جائے گا) بڑے گمراہ کُن ہیں۔ لیکن ان کے صحیح ہونے کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اِسے شہاب صاحب جیسی شخصیت نے بیان کیا ہے۔ یہی بات اگر کسی بھنگڑ ملنگ کا کوئی ملنگ بیان کرتا تو (کم از کم پڑھا لکھا طبقہ) اسے اتنی جلدی سند قرار نہ دیتا۔ دُنیا میں اکثر و بیشتر غلط فہمیاں اور گمراہیاں اسی بنا پر پھیل جاتی ہیں کہ اُن کی بیان کرنے والی بڑی معتبر شخصیتیں ہوتی ہیں۔ شہاب صاحب نے تو چند خلافِ معمول واقعات دیکھے اور غیر مرئی آوازیں ہی سُنیں۔ آپ میری کتاب "تصوف کی حقیقت" میں دیکھئے ـــــ کتنی کتنی بڑی شخصیتیں، کس کس قسم کے خلافِ علم و عقل واقعات پر یقین ہی نہیں رکھتیں بلکہ خود اپنے "مشاہدات" بیان کرتی ہیں۔ ہمارے زمانے میں علامہ اقبالؒ سے بڑا دانشور اور مفکّر کسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ اُن کے متعلق دیکھئے کہ وہ کس کس قسم کی توہم پرستیوں کا شکار تھے[2]۔ "روزگارِ فقیر" کا مؤلف اپنی کتاب کی جلد دوم میں لکھتا ہے :-

> علامہ اقبالؒ پر بھی کبھی عمیق غور و فکر، بلکہ یوں کہئے، استغراق کی ایسی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی کہ وہ اپنے گرد و پیش کے حالات اور ماحول سے یکسر غافل ہو جاتے۔ آخری عمر میں اُن کے دل و دماغ پر اس کیفیت کا غلبہ اور زیادہ ہونے لگا تھا۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ وہ اپنے کمرے میں حسبِ معمول نیم دراز تھے اور کوئی ملاقاتی اُس وقت موجود نہیں تھا۔ اپنے دیرینہ خادم علی بخش کی آہٹ سُن کر وہ چونک پڑے اور اُسے مخاطب کر کے فرمایا :-
> "علی بخش! میرے پاس مرزا غالب بیٹھے ہوئے تھے۔ ابھی ابھی باہر گئے ہیں۔ جلدی

---

[1] اس باب میں تاسف سے زیادہ کچھ حق نہیں۔ یہ شہاب صاحب کا ذاتی معاملہ ہے جس میں کوئی دخیل نہیں ہو سکتا۔

[2] کسی زمانے میں اقبالؒ خود انہیں "شیدہ بازوں کی کمندیں" کہا کرتا تھا۔

جاؤ اور انہیں واپس بُلا لاؤ۔" علی بخش ایک فرمانبردار اور سادہ لوح خادم، علامہ کا حکم سنتے ہی باہر لپکا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر بظاہر مرزا غالب کی تلاش میں ناکام واپس آگیا اور کہا "غالب صاحب مجھے نہیں ملے۔" علامہ نے فرمایا: "بھئی! تم کیا کہہ رہے ہو۔ وہ ابھی تو میرے پاس اس کرسی پر بیٹھے ہوئے دیر تک باتیں کرتے رہے ہیں۔"

انتقال سے چند روز پہلے بھی اسی نوعیت کا واقعہ پیش آیا۔ اس دفعہ انہوں نے مولانا رومیؒ کے متعلق علی بخش سے کہا کہ وہ ابھی میرے پاس سے گئے ہیں۔ انہیں واپس بلا لاؤ۔ اس بار بھی علی بخش مہمان کے خیالی پیکر کو باہر ڈھونڈ کر ناکام واپس آگیا۔ (تصوف کی حقیقت ص۲۶۵)۔

شاہ ولی اللہؒ (محدث دہلوی اور اُن کے خاندان) کی علمی اور مذہبی شہرت سے کون واقف نہیں! اُن کے والد ماجد شاہ عبدالرحیمؒ، اپنا ایک واقعہ یوں بیان فرماتے ہیں:۔

میری ہمشیرہ بیمار تھی۔ گھر کی عورتیں اُس کے گرد یاس و قنوط کے عالم میں بیٹھی تھیں اور میں ساتھ کے کمرے میں تنہا سو رہا تھا۔ یکایک میں نے دیکھا کہ حضرت والد صاحب مرحوم تشریف لے آئے۔ فرمایا کہ شکی کو دیکھنے آیا ہوں۔ ذرا اس کے اور عورتوں کے درمیان پردہ کرا دو۔ میں نے اُٹھ کر مریضہ اور عورتوں کے درمیان چادر لٹکا دی۔ حضرت والد صاحب آگے بڑھے، مریضہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔ دُعا کی اور فرمایا: بیٹی! تیری تکلیفیں ختم ہوگئیں۔ انشاء اللہ صبح کو تو اچھی ہو جائے گی۔ یہ کہا اور کمرے سے نکل گئے۔ میں اُن کے پیچھے پیچھے چلا تو آپ نے اشارہ سے روک دیا اور چند قدم آگے چل کر نظر سے اوجھل ہو گئے۔ میں حیرت و استعجاب سے کھڑا سوچتا رہا کہ حضرت کا تو عرصہ سے انتقال ہو چکا ہے، آج یہاں کیسے آگئے۔ اُسی روز میری ہمشیرہ کا بھی انتقال ہوگیا، اور وہ حضرت والد صاحب کے فرمان کے بموجب طویل علالت سے نجات پاگئیں۔ (ایضاً ص۱۶۱)

نہ تو علامہ اقبالؒ یا شاہ عبدالرحیمؒ کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے جھوٹ بولا تھا۔ نہ ہی اُن کے علم و فضل سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود جو کچھ اُنہوں نے دیکھا وہ حقیقت نہیں تھا۔ (ILLUSION) تھا۔ یعنی اپنے تخیل کی خلاقی۔ (جیسا کہ میں نے اپنی کتاب میں وضاحت سے بتایا ہے) تصوف کی ریاضتیں اور مراقبے، اس قسم کا ذہنی ارتکاز پیدا کر دیتی ہیں۔ جسے عصرِ حاضر میں ہپناٹزم کہہ کر پکارا جاتا ہے[1]۔ یہ (ILLUSIONS) اسی کے پیدا کردہ ہوتے ہیں

---

[1] مشرق میں اسے ابھی تک روحانیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہپناٹزم میں عامل اپنے معمول کو جو جی میں آئے دکھا دیتا ہے اور جو چاہے سنا دیتا ہے۔ معمول اسے حقیقت ہی سمجھتا ہے۔

جنہیں حقائق سمجھ لیا جاتا ہے۔ (ضمناً) ہپناٹزم کیا کچھ کر دکھاتا ہے، اس کی ایک مثال حال ہی میں سامنے آئی ہے۔ (غالباً) امریکہ سے شائع ہونے والے جریدہ (NATIONAL ENQUIRER) میں اس کے اپنے رپورٹر کا بیان شائع ہوا ہے جس میں اُس نے بتایا ہے کہ روس میں فضائی خلا بازوں کو جو مشقیں کرائی جاتی ہیں اِن میں یہ بھی ہے کہ وہ (بغیر سہارے کے) فضا میں تیرتے رہتے ہیں۔ اور یہ کچھ ہپناٹزم کی قوت کے ذریعے کر دیا جاتا ہے۔ اسی جریدہ کی ۱۴ ستمبر ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں اِن خلا بازوں کے فوٹو بھی شائع ہوئے ہیں جو اسی طرح خلا میں تیر رہے ہیں۔ وہاں کے لوگ نہ اس سے مسحور ہوتے ہیں، نہ کوئی خارقِ عادت کرشمہ قرار دیتے ہیں۔ اگر یہی کچھ ہمارے ہاں کوئی "حضرت صاحب" کر کے دکھائیں تو ان کی پرستش ہونے لگ جائے!

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ شہاب صاحب نے تو صرف کچھ خلافِ معمول واقعات دیکھے جنہیں ایک فوت شدہ لڑکی کی روح کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ اور ہمارے ہاں کے اربابِ علم و فضل نے (بقول اُن کے) وفات یافتہ ہستیوں کو جسدِ انسانی میں اپنے سامنے دیکھا، اور اُن سے باتیں بھی کیں۔ شہاب صاحب نے، ان لوگوں کے کہنے کے مطابق کمرے کا فرش کھُدوا کر، وفات شدہ لڑکی کی ہڈیاں برآمد کرا دیں۔ اگر وہ اپنی تفتیش کو آگے بڑھاتے تو ہو سکتا تھا کہ یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ ان خلافِ معمول واقعات کی حقیقت کیا تھی۔ میں نے کہا ہے کہ ہمارے ہاں اس قسم کے واقعات آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں، روزنامہ جنگ (لاہور) کی ۷ر اپریل ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے :-

> ایک اطلاع کے مطابق ڈھیری حسن آباد (راولپنڈی) کے بابا الف شاہ قبرستان میں ایک خاتون کی قبر سے بچاؤ۔ بچاؤ اور ٹھک، ٹھک کی آوازیں آ رہی ہیں۔ مذکورہ خاتون جنوری ۱۹۸۳ء میں انتقال کر گئی تھیں۔ علاقہ کے لوگوں نے کہا ہے کہ یہ آوازیں کل رات سے آ رہی ہیں ..... یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح شہر میں پھیل گئی اور دن بھر بچوں، عورتوں اور مردوں کا تانتا بندھا رہا۔

اس سے، عذابِ قبر کا عقیدہ رکھنے والوں کو سند مل گئی۔ لیکن تین ہی دن بعد، اسی اخبار میں حسبِ ذیل خبر شائع ہو گئی :-

> ڈھیری حسن آباد میں بابا الف شاہ قبرستان میں مدفون محمودہ بیگم نامی خاتون کی قبر سے آنے والی آوازوں کا سلسلہ بند ہو گیا ہے۔ آج چوتھے روز بھی آواز سُننے کے لئے آنے والے لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔ تاہم لوگ قبر پہ فاتحہ اور ورد کرتے رہے۔ علاقے کے لوگوں نے بتایا کہ نمازِ فجر کے بعد نمازیوں کی بڑی تعداد نے آکر قبر پہ فاتحہ پڑھی اور دُعائیں مانگیں۔ (جنگ۔ لاہور۔ ۱۰ر اپریل ۱۹۸۳ء)

کی زحمت اٹھائی ہوتی تو یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ یہ آوازیں کیا تھیں اور کس طرح سنائی دے رہی تھیں۔ اصل یہ ہے کہ وہ واقعات گمراہی کا موجب بن جاتے ہیں جو اتفاقیہ ظہور میں آ جائیں اور ان کی تحقیق نہ کی جائے۔ گمراہی کے اس سرچشمہ کو بند کرنے کے لئے قرآن نے تاکید کی تھی کہ:-

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ۝ (۱۷/۳۶)

جس بات کا تمہیں ذاتی علم نہ ہو، اس کے پیچھے مت لگ جایا کرو۔ یاد رکھو! تمہاری سماعت۔ بصارت اور قلب (MIND) سے پوچھا جائے گا کہ (جس بات کا تم نے یقین کر لیا تھا، کیا اس کی بابت تم نے تحقیق بھی کر لی تھی؟)

دُنیا میں بالعموم اور ہمارے ہاں بالخصوص، جس قدر غلط باتوں کو مسلمات کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے، ان کی وجہ یہ ہے کہ انہیں بڑی بڑی شخصیتوں کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے اور ہم ان کے متعلق خود تحقیق نہیں کرتے۔ اگر ہم قرآنِ کریم کے مندرجہ بالا ارشاد پر عمل کریں تو نہ تو ہم پرستیاں پھیلیں، نہ گمراہیاں وجود پذیر ہوں۔

میں نے گزشتہ سطور میں متعدد بار "گمراہیوں" کا ذکر کیا ہے۔ زیرِ نظر واقعہ سے اگر صرف غلط فہمیاں پیدا ہوتیں تو وہ زیادہ نقصان رساں نہ ہوتیں۔ لیکن یہ جن گمراہیوں کا موجب بن رہا ہے، وہ (ایک مسلمان کے نقطۂ نگاہ سے) بڑی خطرناک ہیں۔ اور یہی اس کی وہ اہمیت ہے جس کی وجہ سے میں نے اسے اس قدر درخورِ اعتنا سمجھا ہے۔ جس انگریزی چٹھی کا میں نے شروع میں ذکر کیا ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ شہاب صاحب نے اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ:-

اس سے انہیں حیات بعد الممات کی حقیقت پر یقین آگیا اور مذہب کے متعلق ان کے عقیدہ میں تقویت پیدا ہو گئی۔

یہ ہے (اس واقعہ پر مبنی) اُن کا عقیدہ جس سے وہ تمام سوالات، شکوک، اعتراضات پیدا ہو گئے جن کا ذکر ابتدا میں درج کردہ خط میں کیا گیا ہے۔ وہ عقیدہ یہ ہے کہ مرنے والوں کی رُوحیں اس دنیا میں آتی ہیں، اور اُن کا یہاں کے احوال و کوائف سے رابطہ رہتا ہے۔ انگریزی خط کے مکتوب نگار تو اس سے بھی دو قدم آگے چلے گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہمارا قرآن کا مطالعہ (ذہنی عیاشی (یا مغلق) سے زیادہ کچھ نہیں رہتا جسے حقائق سے کچھ واسطہ نہیں۔ روح کو شانتی (اطمینان و سکون) ختم۔ درود۔ اوراد و وظائف۔ کونڈوں۔ نیازوں ہی سے حاصل ہوتی ہے۔

یہی وہ گمراہیاں جن کے ازالہ کے لئے میں نے اس عامہ فرسائی کی ضرورت سمجھی ہے۔ شہاب صاحب نے فرمایا ہے کہ اس حقیقت کے مشاہدہ سے کہ روحیں دنیا میں واپس

آج ہمیں حیاتِ بعد الممات کے عقیدہ پر اُن کا یقین پختہ ہو گیا ہے۔ میں اُن کی خدمت میں عرض کروں گا کہ قرآن کریم حیات بعد الممات کا جو تصور پیش کرتا ہے، اس عقیدہ کی رُو سے، وہ تصور جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک تمہید کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

خدا اور حیات بعد الممات کا عقیدہ کسی نہ کسی شکل میں (قریب قریب) ہر مذہب میں پایا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ اس کا منشا اس سے پورا نہیں ہو جاتا کہ تم انہیں جس شکل میں جی چاہے مانو۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (۲/۱۳۷) "اگر یہ (اہل مذاہب) خدا اور آخرت پر اس طرح ایمان رکھیں جس طرح (اے جماعت مومنین) تم ایمان رکھتے ہو، تو پھر تسلیم کیا جائے گا کہ انہوں نے صحیح راستہ اختیار کر لیا ہے"۔ لہٰذا حیاتِ آخرت پر ایمان کے یہ معنی نہیں کہ جس شکل میں ہمارا جی چاہے ہم اسے مان لیں، تو اسے صحیح ایمان سمجھ لیا جائے گا۔ صحیح ایمان یہ ہوگا کہ جس شکل میں اسے قرآن پیش کرتا ہے، اسے اسی شکل میں مانا جائے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ جس شکل میں اسے شہاب صاحب مان رہے ہیں، قرآن کریم اس کے متعلق کیا کہتا ہے۔

مرنے کے بعد کی زندگی کے متعلق بحث، ہمیں حکمائے یونان کے ہاں ملتی ہے۔ ان میں سے فیثا غورث نے یہ نظریہ وضع کیا کہ مرنے کے بعد انسان کی روح پھر اس دنیا میں آتی ہے۔ اسے نظریۂ تناسخ کہا جاتا ہے۔ وہاں سے یہ عقیدہ ہندوؤں نے لیا۔ چنانچہ ان کے دھرم کی ساری عمارت اسی نظریہ (تناسخ یا آواگون) پر استوار ہے۔ چونکہ اس کے حق میں وہ کوئی علمی یا عقلی دلیل دے نہیں سکتے، اس لئے وہ اس قسم کے افسانے وضع کرتے رہتے ہیں، جن سے وہ (بزعم خویش) اس عقیدہ کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے اخبارات میں اس قسم کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ فلاں جگہ ایک بچہ پیدا ہوا ہے (عام طور پر لڑکی) جو بتاتا ہے کہ وہ پچھلے جنم میں کہاں رہتا تھا۔ اس کا باپ کون تھا، وہ کیا کرتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ چند دنوں تک اس قسم کی خبریں اچھی خاصی شہرت حاصل کر لیتی ہیں اس کے بعد یہ غبار خود ہی چھٹ جاتا ہے (علم کی روشنی بڑھ جانے سے اب اس قسم کی خبروں کی تعداد بھی کم ہوتی جا رہی ہے)

یہ ہے بنیاد اس عقیدہ کی کہ مرنے کے بعد روحیں اس دُنیا کے ساتھ اپنا رابطہ بھی رکھتی ہیں اور یہاں ان کا آنا جانا بھی رہتا ہے۔

قرآن کریم نے اس باطل نظریہ کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جب کہا کہ متوفی کا کوئی واسطہ اس دُنیا کے ساتھ نہیں رہتا۔ نہ ہی وہ اس دُنیا میں واپس آتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن کریم میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ میں سردست دو ایک مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

مرجانے والوں کے متعلق سورہ فاطر میں ہے۔ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ (۳۵/۱۴)۔ اگر تم (مُردوں کو) آواز دو، تو وہ تمہاری آواز سُن نہیں سکیں گے۔ اور اگر بفرضِ محال وہ سُن بھی لیتے تو اس کا جواب نہیں دے سکتے۔

سورہ احقاف میں ہے:

> وہ قیامت تک اُن کی آواز نہیں سُن سکیں گے۔ انہیں اس کی خبر تک نہیں ہوتی کہ کوئی انہیں پکار رہا ہے۔ (۳۵/۱۴)

اُن کی آواز سُننا تو درکنار یہ

> انہیں خود اپنے متعلق بھی علم نہیں ہوتا کہ وہ کب اُٹھائے جائیں گے۔ یاد رکھو! وہ مُردہ ہیں۔ زندہ نہیں۔ (۱۶/۲۱) : (۴۶/۵)۔

اب رہا روحوں کا اس دُنیا میں آنا، سو قرآن کریم نے متعدد مقامات پہ بتا دیا ہے کہ زندگی جُوئے رواں است و رواں خواہد بُود ـــــ اسے اپنے ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے آگے بڑھنا ہے، پیچھے نہیں لوٹنا۔ سورہ الزمر میں اس حقیقت کو بڑے عمیق انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا :-

> اللہ نفوس کو وفات دے دیتا ہے اُن کی موت کے وقت۔ اور جو مرے نہیں اُن کی نیند میں۔ جن پہ موت وارد ہو جاتی ہے اُن کے نفوس کو روک لیتا ہے۔ جنہیں ابھی زندہ رہنا ہوتا ہے، اُن کے نفوس کو ایک متعیّن ۔ ۔ ۔ ۔ وقت تک کے لئے لوٹا دیتا ہے۔ یہ ایسا اہم نکتہ ہے جس میں اربابِ فکر و تدبر کے لئے حقیقت تک پہنچنے کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔ (۳۹/۴۲)۔

(۱) میں اس آیت میں بیان کردہ عمیق نکتہ کی تشریح میں نہیں جانا چاہتا۔ زیرِ نظر موضوع کے لئے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ مرجانے والوں کی روحیں روک لی جاتی ہیں۔ وہ دُنیا میں واپس نہیں آتیں۔ (قرآن میں روح کا لفظ ان معانی میں کہیں نہیں آیا، جن معانی میں یہ ہمارے ہاں استعمال ہوتا ہے۔ اس میں نفس ہی کا لفظ آیا ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں اس کا مفہوم "شعور" بھی لیا جا سکتا ہے)۔

(۲) سورۃ شعراء میں ہے کہ اُخروی زندگی میں یہ لوگ کہیں گے کہ :-

> اگر ہمیں ایک بار پھر دُنیا میں جانے دیا جائے تو ہم سچے اور پکے مومن بن جائیں۔ (۲۶/۱۰۲) : (۲/۱۶۷)

ان آیات میں کَرَّۃً کا لفظ آیا ہے۔ یعنی "بارِ دیگر" ـــ ایک دفعہ اور۔ دیگر مقامات پہ تَرُدّ کا لفظ آیا ہے۔ یعنی اگر انہیں ایک بار پھر دنیا میں جانا ہو جائے تو۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے، مرنے والا اس دُنیا کی طرف سے یکسر بے خبر ہوتا ہے۔ یہاں کے احوال و کوائف سے وہ لا تعلق ہو جاتا ہے۔ نہ وہ اِدھر والوں کی سُن سکتا ہے، نہ انہیں اپنی سُنا سکتا ہے۔ اُسے اس دُنیا میں واپس آنے کی آرزو ہوگی، لیکن ایسا ممکن نہیں ہوگا۔ نہ وہ مجسم پیکر میں اِدھر آ سکے گا، نہ اُس کی روح آ سکے گی۔ لہٰذا، اقبالؒ سے ملاقات کرنے والا غالبؔ یا رومیؒ محض اُن کے تخیّل کی

تخیل تھا۔ اور شہاب صاحب نے جس واقعہ کے متعلق سمجھ لیا کہ وہ اس متوفی لڑکی کی روح ہے جو آہ و فغاں کر رہی ہے، ہندوؤں کے تناسخ یا آواگون کے عقیدہ کا غیر شعوری تاثر تھا۔ ایسا ماننا کہ وہ سچ مچ نالہ اور بروقی تھے اور یہ اس لڑکی کی روح، قرآن کے حیات بعد الممات کے تصور سے یکسر خلاف ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں آپ غور کیجئے کہ جس واقعہ کے متعلق شہاب صاحب (ضمنیہ طور پر) کہتے ہیں کہ اس سے ان کے حیات بعد الممات کے عقیدہ کو تقویت ملی ہے کیا وہ عقیدہ قرآن کے مطابق ہے یا اس کی نقیض؟ یاد رکھئے۔ ہمارے پاس سچ اور جھوٹ۔ غلط اور صحیح۔ افسانہ اور حقیقت کے ماپنے کا پیمانہ ایک ہی ہے۔ اور وہ ہے خدا کی کتاب۔ اگر کوئی ایسا واقعہ ہمارے سامنے آتا یا ہم سے بیان کیا جاتا ہے، جو قرآن کے خلاف ہے، تو ہمارا ردِّ عمل یہ ہونا چاہیئے کہ وہ صحیح نہیں۔ اس کے بعد (اگر ممکن ہو تو) ہمیں تحقیقات کے بعد ثابت کرنا چاہیئے کہ وہ واقعی غلط تھا۔ اگر اس قسم کی تحقیق ممکن نہ ہو، تو بھی ہمارا ردِّ عمل یہی ہونا چاہیئے کہ وہ واقعہ صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ارشادِ خداوندی کے خلاف ہے۔

یہ صحیح ہے کہ شہاب صاحب نے وہاں جو کچھ دیکھا اس کے بیان کرنے میں انہوں نے جھوٹ نہیں بولا ہوگا۔ لیکن اس سے انہوں نے جو نتیجہ اخذ کیا (کہ اس لڑکی روح وہ کچھ کر رہی تھی) وہ غلط اور گمراہ کن تھا۔

ان حقائق کی روشنی میں ان اعتراضات یا شکوک کے ازالوں کی ضرورت نہیں رہتی، جن کا ذکر مندرجہ بالا خط میں کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ جب وہ مفروضہ ہی غلط ہے جس پر یہ سوالات متفرع تھے، تو یہ (سوالات) خود بے بنیاد رہ جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ استفسارات سامنے آگئے ہیں، اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ مختصر الفاظ میں ان کی وضاحت کر دی جائے۔ (ان استفسارات کو آپ چٹھی میں بامر دیگر دیکھ لیجئے تاکہ جواب کا مفہوم سمجھ میں آ جائے)۔

(۱) اس دنیا جس پر ظلم و ستم ہوا تھا اور اس کی وجہ سے وہ مضطرب و بے قرار تھا، تو اگلی دنیا میں جا کر اس اضطراب اور درد کا احساس مٹ جائے گا، اور اسے اس کی مظلومیت کے صلہ میں سکون اور راحت نصیب ہوں گے۔ ان زخموں کی یاد تو باقی رہے گی لیکن وہ مندمل ہو چکے ہوں گے اور ان کا درد و سوز ختم ہو چکا ہوگا۔ اس کے برعکس مضطرب و بے قرار وہ ہوگا جس نے اس پر ظلم اور ستم کیا تھا۔ اس کے درد اور سوز کی شدت کا یہاں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسی کو جہنم کی آگ کہا جاتا ہے۔

وہاں سے کوئی شخص اپنا دکھ درد اس دنیا والوں تک نہیں پہنچا سکتا۔ نہ ہی یہاں سے

کوئی اُس کے لئے کچھ کر سکتا ہے۔ جو کچھ کسی نے اِس دُنیا میں کیا ہوگا، وہاں اس کا نتیجہ سامنے آجائے گا۔

(۲) وہاں پہنچ کر بے شک پردے اُٹھ جائیں گے اور حقائق بے نقاب ہو کر سامنے آجائیں گے۔ لیکن جس نے یہاں غلط مسلک اختیار کیا ہوگا اُسے یہ انکشاف حقائق کچھ فائدہ نہیں دے سکے گا۔ کیونکہ نہ تو یہ وہاں صحیح راستہ اختیار کر سکے گا، نہ ہی یہاں کے غلط اعمال کے درد انگیز نتائج کا ازالہ وہاں ہو سکے گا۔

(۳) جب قرآن نے بتا دیا کہ مرنے کے بعد کسی کا تعلق اس دُنیا کے ساتھ نہیں رہتا۔ اور کوئی رُوح واپس نہیں آسکتی، تو اس میں بڑے اور چھوٹے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عظیم شخصیتوں کا حُسنِ کردار، دیگر انسانوں کے لئے (اس دُنیا میں) مشعلِ راہ (اُسوہ یا نمونہ) بن سکتا ہے۔ اس میں (CAUSE) اور (EFFECT) کا رشتہ نہیں ہوتا۔ نہ ہی وہ اس دُنیا سے اِن کے لئے کچھ کر سکتے ہیں۔ جس طرح یہاں سے کوئی اُن کے لئے کچھ نہیں کر سکتا ہے۔

(۴) اب رہے وہ لوگ جن کی کیفیت یہ ہے کہ بظاہر قرآن کے ساتھ لگاؤ ہے، لیکن جونہی کوئی ایسا واقعہ سامنے آیا جو (اُن کے نزدیک) قرآن کے خلاف اور اُن کے فہم سے بالاتر ہے، اُنہوں نے قرآن کا لبادہ اُتار پھینکا کہ —— این دفتر بے معنی غرقِ مے ناب اولٰے —— اُن کی خدمت میں عرض ہے کہ ایک راستہ اُن لوگوں کا ہے جو علم و بصیرت کی رُو سے قرآنی حقائق پر، غور و فکر کے بعد، قلب و دماغ کے کامل اطمینان سے، اِس حقیقت تک پہنچتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے جو کچھ کہا ہے وہ حق و صداقت پر مبنی ہے۔ انہیں اربابِ ایمان و ایقان کہا جاتا ہے۔ اُن کے سامنے اگر کوئی ایسا واقعہ آتا ہے جو بظاہر قرآن کے کسی دعوے کے خلاف جاتا ہے؛ تو ان کا ردِّ عمل یہ ہوتا ہے کہ حقیقت وہی ہے جسے قرآن نے بیان کیا ہے۔ اس میں ذرا شک نہیں۔ یہ فی الحال ہمارے علم کی نارسائی اور تحقیق کی کمی ہے جو ہم اس واقعہ کی کنہ و حقیقت تک نہیں پہنچ رہے اس کے بعد وہ اپنی تحقیق و جستجو کو جاری رکھتے ہیں تاکہ وہ بے نقاب دیکھ لیتے ہیں کہ اَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳) - یہی بات قرآن ہی کی ہے۔

دوسرا راستہ ان لوگوں کا ہے جو قرآن کا مطالعہ اس غرض سے کرتے ہیں کہ اس سے انہیں ان کے اپنے خیالات، نظریات یا معتقدات کی سند اور تائید حاصل ہو جائے۔ جب تک ایسا ہوتا رہتا ہے، وہ قرآن سے مطمئن رہتے ہیں۔ لیکن جونہی اس میں کوئی ایسی بات نظر آئی جو ان کے کسی نظریہ وغیرہ کے خلاف ہے، یا کوئی ایسا واقعہ نمودار ہوا جو انہیں قرآن کے خلاف نظر آتا ہے، اور اُن کے فہم سے بالاتر ہو، تو وہ قرآن سے یوں باہر نکل جاتے ہیں جس طرح (قرآنی تشبیہ میں)

سانپ اپنی کینچلی سے باہر نکل جاتا ہے کہ اس پر اس کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ قرآن ایسے لوگوں کو ارباب ایمان کے زمرے میں شامل نہیں کرتا، بلکہ کہتا ہے کہ وہ خدا کو علیٰ حرفٍ مانتے ہیں (۲۲/۱۱) یعنی (SITTING ON THE FENCE)

ایسی روش فریب دہی کے لئے اختیار کی جائے یا خود فریبی کی وجہ سے (جو بالعموم خود اعتمادی کے فقدان کا نتیجہ ہوتی ہے)۔ قرآن اسے نفسیاتی مرض قرار دیتا ہے۔ (۲/۱۰-۸) اور اس کا علاج بھی بتاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو جو خود اعتمادی کے فقدان یا خود فریبی کے مرض میں مبتلا ہوں، تصوف کی پناہ گاہیں بڑی راس آتی ہیں۔ کیونکہ وہاں نہ تحقیق کی زحمت اٹھانی پڑتی ہے، نہ تجسس کی کاوش۔ وہاں مسلک یہ ہوتا ہے کہ ——

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید —— اور زندگی ایسی کہ —— گوش بند و چشم بند و لب بہ بند

—— یہی وہ مقامات ہیں جہاں ایسا شخص (ILLUSIONS) کو حقائق سمجھ لیتا ہے اور اس نشہ میں ایسی لذت محسوس کرتا ہے کہ وہاں سے نکلنے کو اس کا جی نہیں چاہتا۔

خدا کرے کہ میری یہ گذارشات، میرے لندن کے رفقاء کے لئے وجہ طمانیت ہو جائیں۔

—— چہ کند بے نوا ہمیں دارد۔ والسلام۔

قراردادِ تعزیت

بزم طلوعِ اسلام کراچی کا یہ اجلاس بزم کے دیرینہ اور مخلص کارکن جناب عبدالمجید بالحافظہ صاحب کے انتقال پر اپنے رنج وغم کا اظہار کرتا ہے۔ کراچی کے قرآنی احباب اس کے شاہد ہیں کہ موصوف کا قرآن کریم سے گہرا لگاؤ تھا خصوصی طور پر نشر و اشاعت کے کاموں میں انہوں نے جو کردار انجام دیا ہے وہ کراچی کے احباب کے لئے ایک مثالی حیثیت کا حامل ہے۔ بزم کراچی اپنے اس دیرینہ ساتھی کی کمی کو عرصہ تک شدت سے محسوس کرتی رہے گی۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے پس ماندگان کو اس صدمہ کے برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ادارہ طلوع اسلام مندرجہ بالا قرارداد سے متفق ہے، اور بزم کراچی اور مرحوم کے اعزہ کے ساتھ شریک غم۔